شبلی صدی مطبوعات : ۱۹

مراسلات شبلی



ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

مراسلاتِ شبلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مراسلاتِ شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

(سلسلہ مطبوعات دارالمصنّفین نمبر)

- نام کتاب : مراسلات شبلی
- مرتب : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
- ناشر : دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
- مطبع :
- طبع اول : اپریل ۲۰۱۶ء
- قیمت : Rs:150/-

ملنے کا پتہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، شبلی روڈ، اعظم گڑھ، یوپی، ۲۷۶۰۰۱

فہرست

دیباچہ

علامہ شبلی کی ملی دردمندی کے بہت سے مظاہر میں ان کے وہ مراسلات اور تجاویز بھی شامل ہیں جو انہوں نے اخبارات و رسائل میں لکھے اور وقتاً فوقتاً شائع کئے۔ یہ مراسلات بنیادی طور پر ملت کی علمی و تعلیمی ترقی اور اسلام کی حفاظت و اشاعت کی غرض سے لکھے گئے۔ مراسلات لکھنے کی ایک غایت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ عام ہو جائیں، ملت کے ممتاز افراد و اشخاص بالخصوص ارباب نظر تک پہونچ جائیں اور ان پر بحث ومباحثہ ہو، ان کی اہمیت و افادیت اجاگر ہو، اس کے بعد جو لائحہ مل سامنے آئے اس کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

علامہ شبلی نے مختلف موضوعات پر ۲۶/ مراسلے لکھے ہیں۔ ان میں وہ ملت کو درپیش مختلف مسائل کے سلسلہ میں جو کچھ کرنا چاہتے تھے ان کی توضیح و تفصیل پیش کی ہے اور زیر بحث موضوعات سے متعلق نہایت ہی دل سوزی کے ساتھ اپنے خیالات پیش کئے ہیں یہی وجہ ہے کہ اہل علم اور ارباب نظر نے ان کی طرف نہ صرف بھرپور توجہ دی بلکہ اس میں حصہ بھی لیا، یہ حصہ داری مفید مشوروں کے لحاظ سے بھی ہے اور عملی جدوجہد کے لحاظ سے بھی گویا دامے، درمے، قدمے، سخنے، ہر لحاظ سے ملت کے بہی خواہوں نے ان منصوبوں میں حصہ لیا۔ اس کی تفصیل اس کتاب میں جستہ جستہ مختلف مقامات پر پیش کی گئی ہے۔

مکتوبات شبلی کی تدوین کے زمانہ میں ان مراسلات کو علاحدہ جمع کرنے اور ان

پر علاحدہ سیر حاصل گفتگو کا خیال پیدا ہوا لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا تھا کہ محض چند مراسلات کو جمع کرنے اور ان پر توضیحی حواشی لکھنے سے شاید بات نہ بنے اور غالباً یہ مراسلات ایک کتاب کے متحمل نہ ہوسکیں۔ مگر جب تمام دستیاب مراسلات کو جمع کیا اور ان کے پس منظر اور بعد کی تفصیلات سامنے آئیں تو اپنے ہی خیال کی نہ صرف تغلیط ہوئی بلکہ حق یہ ہے کہ اگر یہ کام نہ ہوتا تو علامہ شبلی کی علمی اور ملی خدمات کے ایک اہم باب کے صفحات سادہ رہ جاتے۔

علامہ شبلی نے جو مراسلات لکھے ہیں ان میں چند غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور بعض کا شمار ان کے اولیات میں ہونا چاہئے۔ مکہ یونیورسٹی کی تجویز، دارالمصنّفین کی تجویز، سیرۃ النبیؐ کی تجویز وغیرہ سے متعلق مراسلوں میں انہوں نے نہ صرف تجاویز پیش کی ہیں بلکہ ان میں اپنی عملی شرکت کا اظہار و اعلان بھی کیا ہے۔ مثلاً مکہ یونیورسٹی کی تجویز میں انہوں نے لکھا ہے کہ

> میں بہ ایں ضعف اور شکستہ پائی یہ کر سکتا ہوں کہ اس تحریک کے لیے تمام ہندوستان کا دورہ کروں اور پھر ہجرت کر کے مکہ معظّمہ چلا جاؤں اور اس مبارک جامعہ میں جاروب کشی کی خدمت انجام دوں۔
>
> (روزنامہ زمیندار، ۱۵/اپریل ۱۹۱۳)

ان مراسلات پر بحثیں ہوئیں اور اہل علم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا مثلاً مکہ یونیورسٹی کی تجویز پر جہاں موافقت اور حمایت میں مراسلے اور مضامین شائع ہوئے وہیں بعض آوازیں مخالفت میں بھی بلند ہوئیں۔ خود ان کے شاگرد مولانا ظفر علی خاں نے مکہ یونیورسٹی تجویز کی شدید مخالفت کی اور اس کے خلاف روزنامہ زمیندار لاہور میں تین قسطوں میں مضمون لکھا۔

ارتداد کے فتنہ نے علامہ شبلی کی حمیت اسلامی کے جذبہ کو برانگیختہ کیا تو انہوں نے

حفاظت واشاعت اسلام کی تحریک کا آغاز کیا اور یہ تحریک اس قدر وسعت کے ساتھ برپا کی کہ اس میں مسلمانوں کے مختلف مسالک و مذاہب کے لوگ شامل تھے۔ غرض ان کے تصور حفاظت واشاعت اسلام میں بڑی وسعت تھی۔ ندوہ سے استعفیٰ اور پھر موت کی وجہ سے یہ اہم کام تشنۂ تکمیل رہ گیا۔ اس کتاب میں اس سلسلہ کی دیگر تفصیلات بھی جمع کر دی گئی ہیں۔

علامہ شبلی کو ترکوں سے بڑی محبت تھی۔ ۱۸۷۷ء میں روس نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا اس وقت علامہ شبلی نوجوان تھے۔ جوش حمیت میں ترکوں کے تعاون کے لئے اپنے وطن اعظم گڑھ سے تین ہزار کی رقم جمع کی اور ترکی سفیر بمبئی کے ذریعہ اسے ترکی بھیجا۔ پھر دوبارہ ترکی پر حملہ ہوا تو انہوں نے ترکوں کے تعاون کے لئے یہ فتوی دیا کہ اس سال قربانی نہ کی جائے اور اس طرح بچنے والی رقم ترکوں کی اعانت کے لئے بھیجی جائے۔ اس کا انہوں نے ایک مراسلہ کے ذریعہ تمام ہندوستان میں اعلان کیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس میں بھی ان کی حمایت نہ کی۔ اس کی تفصیل بھی کسی قدر اس کتاب میں آ گئی ہے۔

علامہ شبلی نے ندوہ کے لئے علی گڑھ کالج کی مسند نشینی چھوڑی اور لکھنؤ جا کر ندوہ کی بوریہ نشینی اختیار کی اور کئی برس تک انتہائی کامیابی کے ساتھ ندوہ کو چلایا بلکہ حق یہ ہے کہ ان سے پہلے ندوہ محض ایک تحریک تھا، دارالعلوم ندوہ نہ تھا۔ ان کی کوششوں نے ندوہ کو ندوہ بنایا لیکن کچھ لوگوں نے انہیں ندوہ میں چین سے رہنے نہیں دیا۔ ان میں پیش پیش مولوی خلیل الرحمٰن سہارن پوری تھے۔ اسی کشمکش کے زمانہ میں مولوی عبدالکریم صاحب نے ماہنامہ الندوہ میں جہاد پر ایک مضمون لکھا جس کی پاداش میں انہیں معطل کر دیا گیا۔ یہ معطّلی تمام معتمدین کے ایما اور متفقہ فیصلہ سے ہوئی مگر بعد میں اس کی تمام تر ذمہ داری مولانا شبلی کے سر منڈھ دی گئی۔ اس سے متعلق تین مراسلے اس کتاب میں شامل ہیں۔ یہ تینوں مراسلے اخبارات سے نقل کئے گئے ہیں۔ ان کے ضمن میں اختلافات ندوہ کی کسی قدر تفصیلات بھی آ گئی ہیں۔

اس مجموعہ میں مراسلات پر جو توضیحی حواشی لکھے گئے ہیں ان میں توضیح وتشریح کے ساتھ رجال کے تذکرے بھی شامل ہیں۔کوشش یہ کی گئی ہے کہ صاحب تذکرہ سے اگر علامہ شبلی کا کسی قسم کا تعلق رہا ہے تو اس کی تفصیلات یکجا سامنے آجائیں۔توضیحی حواشی علی العموم حیات شبلی اور یادرفتگاں سے لئے گئے ہیں کہ یہ کتابیں اس شخص کے قلم سے ہیں جس کی حیثیت چشم دید گواہ کی ہے اور جو جانشین شبلی بھی ہے اور ندوہ کا معتمد تعلیم بھی۔

ان مراسلات سے جو بات سب سے واضح طور پر سامنے آئی ہے وہ یہ کہ علامہ شبلی ہمہ وقت ملت کے لئے فکرمند رہتے تھے اور اس کو زوال کے بھنور سے نکالنے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے طرح طرح تدبیریں کرتے رہتے تھے۔خاص بات یہ ہے کہ یہ سب وہ تنہا کرنے کے بھی خواہاں نہ تھے بلکہ ان کی خواہش تھی وہ تمام لوگ جو ملت کا درد رکھتے ہیں،اس میں شامل ہوں اور تمام ملی ورفاہی کاموں کو مشترکہ اور متفقہ طور پر انجام دیا جائے۔

مذکورہ مراسلات میں سے کئی مقالات شبلی جلد ہشتم میں شائع ہو چکے ہیں اور مولانا سید سلیمان ندوی نے انہیں مضامین و مقالات کے طور پر شائع کر کے محفوظ کر دیا ہے۔البتہ اس میں چندنو دریافت مراسلات زیادہ اہمیت کے اس لئے حامل ہیں کہ ان میں بیش تر حیات شبلی کے مصنف کی نظر سے نہیں گذرے تھے۔سید صاحب نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی کا نام مدینہ یونیورسٹی میں تدریس کے لئے تجویز ہوا تھا لیکن اس سلسلہ میں علامہ شبلی کے مراسلہ اور اس میں زمیندار کے نوٹ سے واضح ہے کہ ان کا نام دراصل مدینہ یونیورسٹی کے لئے نصاب تعلیم تیار کرنے کے لئے تجویز ہوا تھا اور کمیٹی میں ان دونوں بزرگوں کے ساتھ علامہ اقبال کا نام بھی شامل تھا۔یہ انکشاف حیات اقبال میں بھی ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے کہ حیات اقبال بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔

مدینہ یونیورسٹی کے نصاب کے سلسلے میں علامہ شبلی کا جو مراسلہ شائع ہوا ہے وہ

متعدد وجوہ سے بے حد اہم ہے۔

مراسلات شبلی میں شامل دو مراسلے مکاتیب اور مکتوبات شبلی میں مکتوب کے طور پر شائع ہوئے ہیں بقیہ یا تو مقالات شبلی میں شامل ہیں یا پھر اب تک وہ نظروں سے اوجھل تھے۔ شروع میں دو عربی مراسلے ہیں جو ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی کے وسعت مطالعہ و تحقیق کے نتیجے میں دریافت ہوئے ہیں اور نہایت اہم علمی و ادبی مسائل پر مشتمل ہیں۔ ان کا اردو ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے۔ اس کی تصحیح بھی ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی صاحب نے کی ہے۔ اس تعاون کے لئے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

''مراسلات شبلی'' اردو میں مراسلات کا پہلا مجموعہ ہے جو حیات شبلی کے چند نئے گوشوں اور جدید مطالعات پر مشتمل ہے۔ اس سے مکمل شبلی کی بازیافت میں یقینی طور پر مدد ملے گی اور یہی اس کتاب کی اشاعت کا بنیادی مقصد بھی ہے۔

اس کتاب کی جمع و ترتیب میں سب سے بڑا حصہ دارالمصنّفین کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ شفقت دراز فرمائے۔ اشاریہ کے لئے مولانا کلیم صفات اصلاحی کا ممنون ہوں۔

۲۱/مارچ ۲۰۱۶ء

محمد الیاس الاعظمی
رفیق اعزازی دارالمصنّفین

[ا]

اظہارتشکر

''عطائے خطاب کی تقریب میں اکثر بزرگانِ قوم نے مبارک بادی کے جوخطوط لکھے اور میرے رتبہ اور حالت سے بہ درجہا بڑھ کر جن الفاظ میں قدر دانی کا اظہار کیا، ان کا اثر اگر چہ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ میں ''ایاز قدر خود بشناس'' کا مقولہ بھول جاتا، تاہم کچھ شبہ نہیں کہ وہ تحریریں میرے دائمی شرف وعزت کی باعث ہیں اور میں ان بزرگوں کا جس قدر شکریہ ادا کروں کم ہے۔مسلمانوں کے عہد حکومت میں اور آج بھی جہاں اسلامی حکومت ہے وہاں کے حکومت کے عطا کردہ خطابات سے قومی خطابات کی عزت زیادہ کی جاتی ہے۔اس لحاظ سے میری اس عزت افزائی کی نسبت ان بزرگانِ قوم کی طرف سے پسندیدگی اور خوشی کا اظہار جو ہماری قوم کے جائز قائم مقام ہیں، اور جن میں افتخار الدولہ فخر الملک صاحب زادہ محمد عبیداللہ خاں بہادر فیروز جنگ سی ایس آئی، نائب ریاست ٹونک (۱) سردار محمد حیات خان بہادر سی ایس آئی (۲) نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں صاحب (۳) نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین (۴) مولوی سید اکبر حسین صاحب جج (۵) حاجی محمد اسمٰعیل خاں (۶) کے مبارک نام شامل ہیں، سب سے بڑی عزت ہے جو مجھ کو عطا کی جاسکتی ہے۔

علی الخصوص لسان الملک فخر قوم اور مخدوم قوم مولانا الطاف حسین صاحب حالی دام مجدہٗ (۷) کی نظم جو جناب موصوف نے اس موقع پر لکھی ہے، میرے لئے تمغائے فخر اور سندعزت ہے، بے شبہ یہ وہ بڑی سے بڑی عزت ہے جو مجھ کو حاصل ہوسکتی تھی اور جس

کے حاصل ہونے پر مجھ کواور کسی عزت کی خواہش نہیں ہوسکتی۔''

(حیات شبلی ص ۲۸۷-۲۸۸ شبلی صدی ایڈیشن)

تعلیقات و حواشی

جنوری ۱۸۹۴ء میں علامہ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ اس وقت علامہ کی عمر ۳۶-۳۷ رسال تھی۔ ایم اے او کالج کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا جب کسی استاذ کو شمس العلماء کا خطاب تفویض ہوا، نیز اس وقت تک ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا حالی کو بھی یہ خطاب نہیں ملا تھا۔ اس اہمیت کی بنیاد پر اس کی ہر طرف دھوم مچ گئی اور علامہ شبلی کو مبارک باد دینے اور تہنیت پیش کرنے کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا۔ علامہ شبلی نے اس کے جواب میں مذکورہ بالا مراسلہ شائع کرایا۔ یہ مراسلہ ۱۶ر جنوری ۱۸۹۴ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا ہے۔

(۱) افتخار الدولہ، فخر الملک محمد عبیداللہ خاں بہادر فیروز جنگ سی ایس آئی نائب ریاست ٹونک: مزید تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۲) سردار محمد حیات خاں بہادر سی ایس آئی: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۳) نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں [۱۸۳۷-۱۹۰۷ء] علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی اور علی گڑھ تحریک کے کاروان اول کے رکن رکین تھے۔ علامہ شبلی سے بڑے گہرے اور دیرینہ تعلقات تھے۔ علامہ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ملنے پر ایم اے او کالج میں جو تہنیتی جلسہ منعقد ہوا تھا، اس کی صدارت بھی نواب محسن الملک نے فرمائی تھی۔ اس موقع پر انہوں نے طویل صدارتی تقریر کی تھی، اس کا ایک مختصر اقتباس یہ ہے، فرماتے ہیں:

> ''صاحبو! ہمارے دوست مولانا مولوی شبلی صاحب نے نہ صرف مسلمانوں پر اپنی عمدہ تالیفات سے احسان کیا ہے بلکہ درحقیقت اسلام بھی ان کا ممنون ہے اور خدائے ذوالجلال کی رضامندی حاصل کرنے کا بھی

انہوں نے نہایت عمدہ کام کیا ہے۔ وہ ان چند اعتراضوں کو دور کرتا ہے جو مذہب اسلام کے مخالف ہمارے مذہب پر کرتے تھے اور جن سے ہمارا مذہب انسانیت، انصاف، علم اور تہذیب کے مخالف خیال کیا جاتا تھا۔ وہ جزیہ اور اسکندریہ کے کتب خانہ کا جلانا تھا کہ برسوں سے یہ الزام ہم پر لگایا جاتا پر اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی، لوگوں نے جزیہ کو کفر کا ٹیکس قرار دے رکھا تھا اور اسکندریہ کے کتب خانہ کو جلانے سے پیشوایان اسلام کو علم کا دشمن مشہور کر دیا تھا۔ اس ذی ہمت، عالی دماغ محقق نے جو مدرسۃ العلوم کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا حکیمانہ زندگی بسر کر رہا تھا ان دونوں چیزوں کی حقیقت ظاہر کرنے میں اپنی تحقیق کی ایک عجیب خداداد قوت ظاہر کی اور چند اوراق کے لکھنے اور مشتہر کرنے سے ایک عالم کو حیرت میں ڈال دیا اور یورپ کے بڑے بڑے محققوں کی آنکھوں پر سے غلطی کا پردہ اٹھا دیا اور ان دونوں اعتراضوں کو اس خوبی سے مذہب اسلام پر سے دور کر دیا کہ تمام دنیا حیران رہ گئی۔''

(حیات شبلی ص ۲۷۱-۲۷۲، شبلی صدی ایڈیشن)

نواب صاحب کی مدۃ العمر خواہش رہی کہ علامہ شبلی علی گڑھ واپس آ جائیں۔ اس کے لئے وہ ہمیشہ کوشش کرتے رہے، انہوں نے حکومت سے بھی گفتگو کر کے راہ ہموار کی [مکاتیب شبلی ج ا ص ۱۴۰] مگر علامہ شبلی نے ندوہ کے آگے اپنے احباب کی تمام خواہشیں رد کر دیں۔ ایک مرتبہ علامہ شبلی سخت علیل ہوئے تو نواب صاحب ان کی عیادت کے لئے اعظم گڑھ تشریف لائے اور شبلی منزل میں تین دن قیام کیا۔ ۱۹۰۷ء نواب صاحب نے وفات پائی تو علامہ شبلی نے ''ہائے محسن الملک'' کے عنوان سے ماہنامہ الندوہ [اکتوبر ۱۹۰۷ء] میں ان کا بڑا غم انگیز ماتم کیا۔ (دیکھیں حیات محسن از امین زبیری)

(۴) نواب وقار الملک: مولوی مشتاق حسین [۱۸۴۱-۱۹۱۷ء] سراواں ضلع میرٹھ وطن تھا۔ بچپن

ہی میں والد نے انتقال کیا، چنانچہ ان کی والدہ نے ترک وطن کر کے امروہہ میں سکونت اختیار کی، پھر یہی ان کا وطن قرار پایا۔ یہیں انہوں نے تعلیم وتربیت حاصل کی اور امروہہ ہی میں ایک اسکول میں مدرس مقرر ہوئے، پھر محرر ہو کر مرادآباد آئے، قحط کے زمانہ میں سرسید احمد خاں کا تبادلہ مرادآباد ہوا تو انہوں نے نواب وقارالملک کو راحت رسانی کے کاموں کا ذمہ دار بنایا جسے انہوں نے بخوبی نبھایا۔ نواب صاحب نے مختلف عہدوں پر کام کیا۔ ریاست حیدرآباد سے بھی بحیثیت صدر تعلق دار وابستہ رہے اور اپنی گراں قدر خدمات کے صلہ میں وقارالدولہ اور وقارالملک کا خطاب حاصل کیا۔ (دیکھیں وقار حیات از محمد اکرام اللہ ندوی) پھر علی گڑھ آئے اور سرسید کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ مسلم لیگ کے قیام میں ان کی آراء کو بھی دخل تھا۔ وہ علی گڑھ میں بورڈ آف ٹرسٹی کے آنریری سکریٹری نامزد ہوئے۔ انہیں کے زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک شروع ہوئی چنانچہ انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں لگا کر اس کے لئے اتنا چندہ جمع کیا کہ یونیورسٹی کی تاریخ میں پھر کبھی اتنا چندہ جمع نہیں ہوا۔ ۲۷/مارچ کو امروہہ میں وفات پائی۔ علامہ شبلی سے گہرے مراسم اور خط و کتابت تھی۔ مکاتیب شبلی اور مکتوبات شبلی میں ان کے تین خطوط شامل ہیں جن سے گہرے ربط وضبط کا پتہ چلتا ہے۔

(۵) مولوی سید اکبر حسین، اکبر الہ آبادی: [۱۸۴۶-۱۹۲۱ء] اردو میں طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے باوا آدم۔ علامہ شبلی کے بڑے قدرشناس تھے، متعدد اشعار میں علامہ شبلی کے علم وفضل کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

ایڈیٹر بول اٹھے دیکھ کر شبلی کے فوٹو کو
اسی کے دم سے اب زندہ ہے مشرق کا کتب خانہ

واہ! کیا بات ہے تری شبلی
نثر میں بھی ادائے غالب لی

شبلی کا قلم علم کی منزل پہ جما ہے　　رفتار پہ آنز کی قدم اس کا تھما ہے
چمکی ہوئی ہے بزم سلف اسکے بیاں سے　　روشن ہیں یہ معنی کہ وہ شمس العلماء ہے

مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ الہ آباد کی ایک مجلس میں علامہ شبلی نے اکبرالہ آبادی سے کہا کہ میں آپ کی تلاش قافیہ کا جب قائل ہوں گا جب آپ میرے نام کا قافیہ باندھیں۔ اکبرالہ آبادی نے ہنس کر کہا ''دیکھئے آپ کو بھی باندھتا ہوں'' بات ہنسی مذاق میں ختم ہوگئی، دوروز بعد اکبرالہ آبادی نے دعوت کا ایک منظوم رقعہ شبلی کے پاس بھیجا:

آتا نہیں مجھ کو قبلا قبلی　　بات صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اٹھاؤ آج کی رات　　کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا　　سمجھو اس کو پلاؤ قلیا

علامہ شبلی نے بھی اس منظوم دعوت نامے کا منظوم جواب لکھا:

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال　　لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں　　حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں
لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا　　اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں

دل کو بہلانے کی باتیں ہیں وگر نہ شبلی
جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں

اکبرالہ آبادی کا علامہ شبلی کے نام ایک خط میری کتاب شبلی کے نام اہم علم کے خطوط میں شامل ہے۔ اس سے دونوں کے درمیان گہرے تعلق بلکہ بے تکلفی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۸ رنومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے وفات پائی تو اکبر نے درج ذیل قطعہ تاریخ کہا:

تھے مولانا شبلی بے شک اپنے علم و فن میں راسخ
ان کی موت ہے قومی ماتم سال رحلت فوت مورخ

(دیکھیں یادرفتگاں از سید سلیمان ندوی)

(۶) حاجی محمد اسماعیل خاں: علی گڑھ کے ایک قصبہ دتاولی کے رئیس اور سرسید کے نہایت قریبی دوست تھے۔ سرسید کا انتقال انہیں کے گھر پر ہوا تھا، حاجی صاحب علی گڑھ تحریک کے نہایت سر برآوردہ لوگوں میں تھے۔ محمڈن اینگلو کالج کی مجلس انتظامیہ کے نائب صدر رہے۔ متعدد کتابیں بھی لکھیں ہیں۔ رسالہ معارف علی کے نکالنے میں وحیدالدین سلیم کے شریک کار رہے۔ علامہ شبلی سے بھی دیرینہ مراسم تھے۔ آخر میں آگرہ منتقل ہو گئے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔ (حواشی کلیات مکاتیب اقبال ج ا ص ۸۴۷)

(۷) مولانا الطاف حسین حالی [۱۸۳۷-۱۹۱۴ء] ادیب، شاعر، نقاد اور بلند پایہ سوانح نگار تھے۔ ان کا شمار جدید اردو نثر کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ مسدس حالی [م ۱۸۷۹ء] حیات سعدی [م ۱۸۸۶ء] دیوان حالی [م ۱۸۹۳ء] مقدمہ شعر و شاعری [م ۱۸۹۳ء] یادگار غالب [م ۱۸۹۷ء] حیات جاوید [۱۹۰۱ء] ان کی بلند پایہ یادگاریں ہیں۔ خاص طور پر مقدمہ شعر و شاعری ان کا بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

علامہ شبلی ان سے بیس سال چھوٹے تھے، تاہم دونوں ایک دوسرے کے بڑے والہ وشیدا تھے۔ شبلی کے علی گڑھ کے زمانہ قیام میں تعلقات استوار ہوئے، جو آخر تک قائم رہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے علم و فضل کا ہمیشہ برملا اظہار کیا۔ حالی نے حیات سعدی لکھی تو علامہ شبلی نے اس پر عقیدت مندانہ تبصرہ کیا، شبلی نے سیرۃ النعمان لکھی تو حالی نے علم و تحقیق کی داد دی۔ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ملا تو مولانا حالی نے ''تهنية المحب الى الحبيب'' کے عنوان سے عربی میں قصیدہ لکھا، غرض دونوں بزرگوں میں ہمیشہ گہرے مراسم رہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں مولانا حالی کے عربی قصیدہ کا عنوان ''من الحبيب الى الحبيب'' لکھا ہے مگر یہ درست نہیں اس لئے کہ یہ قصیدہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں تهنية المحب الى الحبيب کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ (حالات حالی کے لئے دیکھیں یادگار حالی از صالحہ عابد حسین)

[۲]

الف لیلہ ولیلہ

(جواب على اقتراح حكمت بك شريف في صفحة ٨٥٢ من هلال السنة الثالثة)

حضرة الفاضل منشئ الهلال الأغر:

لا يخفى ما لأهل النظر من تشعب الآراء في تحقيق كيفية تأليف هذا الكتاب. فأقتصر الآن على شذرات تغني عن اطالة الكلام واسهابه فی هذا الموضوع.

معلوم أن الدولة العباسية لما بلغت ذروة التمدن أفرغت الجهاد في اقتناء العلوم الاجنبية التي لم يبق للعرب الـمام بها. ثم انهم لم يقتصروا على نقل العلوم الفلسفية فقط، بل اختاروا من كل موضوع

[الہلال سال سوم کے صفحہ۸۵۲ پر درج حکمت بک شریف (ا) کی تحریر کے جواب میں]

محترم بانی مدیر مجلّہ الہلال

اس کتاب (الف لیلہ ولیلہ) کی ترتیب وتالیف کے باب میں اہل نظر کے یہاں جو مختلف خیالات پائے جاتے ہیں وہ کوئی پوشیدہ بات نہیں، میں مختصراً اس موضوع پر کچھ اشارات کے ذکر پر اکتفا کروں گا جس کے بعد کسی طول کلام کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ عباسی حکومت جب تمدن کے اعلی مقام پر پہونچی تو اس نے ان بیرونی علوم کو حاصل کرنے میں اپنی پوری توانائی صرف کی، جن سے عرب

ما يشحذ الذهن وينشط الخاطر. ولما كانت تلك الدولة مجاورة للفرس و كان جلُّ أركانها فارسيَّ العصبة واللهجة كان اعتناؤهم بعلوم الفرس أكثر من اعتنائهم بعلوم مصر واليونان والهند. و تجد الكتب المترجمة عن اليونان مقصورةعلى الفلسفة والطب، أما ما ترجموه عن الفرس فمعظمه من السير و التواريخ والفكاهات والأمثال و غيرها. فمن كتب التاريخ: كتاب رستم و اسفند يار، و كتاب بهرام جوبين، و كتاب شهرزاد مع برويز، و كتاب الكارنامه في سيرة أنوشروان، و كتاب التاج، وكتاب دارا و صنم الذهب، وكتاب دونامه، و كتاب خداي نامه، و كتاب بهرام و نرسي، وكتاب كهن نامة و غيرها.

ومن كتب الأسمار: كتاب يوسفاس،وكتاب خرافة، وكتاب الدبّ و الثعلب،وكتاب "روزبة"،

ناواقف تھے، پھرانہوں نے صرف فلسفیانہ علوم کو ہی عربی میں منتقل کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہر موضوع پر ایسی کتابوں کا انتخاب کیا جو دل ودماغ کو جلا بخشنے والی تھیں۔اور چونکہ یہ حکومت ایران کے پڑوس میں واقع تھی اوراس حکومت کے زیادہ تر کارندے فارسی الاصل اور فارسی لب ولہجے کے عادی تھے اس بنا پر مصرویونان اور ہندوستان کے علوم کے مقابلے میں فارسی علوم پر زیادہ توجہ دی گئی۔یونان سے جو کتابیں ترجمہ ہوئیں وہ فلسفہ اور طب کے موضوعات تک محدود ہیں لیکن فارسی سے جو تراجم ہوئے ان کا بڑا حصہ سوانح، تاریخ، تفریحی حکایات اور امثال پر مشتمل ہے،اس طرح کی تاریخی کتابوں میں رستم واسفندیار، بہرام چوبیں، شہزاد اور پرویز، نوشیرواں کی سوانح ''کارنامہ''، کتاب التاج، کتاب داراوصنم الذہب، دونامہ، خدائی نامہ، بہرام ونرسی، کہن نامہ وغیرہ ہیں۔

قصہ گوئی پر مشتمل کتابیں بھی ترجمہ ہوئیں جیسے کتاب یوسفاس، کتاب خرافہ،

و كتـاب "شـاه زنـان"، و كتـاب نمرود، و كتاب خليل.

وكان من جملة كتب الأسمار: كتـاب يسـمَّـى "هـزار افسـانـه" و معـنـاه: ألف سـمر، فان "هزار" بـالـفـارسـي: الألف. و "افسانه": السـمـر. وكـان سبـب تـأليفه على ماصرَّح به ابن النديم البغدادي في كتـاب الـفهـرس: " أن مـلكـاً من مـلـوكهـم كـان اذا تزوج امرأةً و بـات معهـا ليـلةً قتـلهـا من الغد. فتزوَّج بجارية من أولاد الملوك لها عـقـل و درايةيـقـال لها: "شهرزاد". فـلـمـا حـصـلت معه ابتدأت تُخرفه، و تصل الحديث عند انقضاء الليل بما يحمل الملك على استبقائها، ويسـألهـا فـي الليلة الثانيةعن تمام الـحـديـث، الـى أن أتى عليها ألف ليـلة. وهو مع ذلك يطؤها الى أن رزقـت مـنـه ولداً أظهرته، وأوقفته على حيلتهاعليه. فاستعقلها، ومال

ریچھ اور لومڑی، کتاب روزبہ، شاہ زناں، کتاب نمرود اور کتاب خلیل وغیرہ۔

ایسی ہی قصہ کی کتابوں میں ایک کتاب کا نام ہزار افسانہ ہے۔اس کے معنی ہزار قصے ہیں کیونکہ فارسی زبان میں "الف" کو ہزار اور قصہ کو افسانہ کہتے ہیں اور اسکا سبب تالیف ابن ندیم بغدادی نے کتاب الفہرست میں یوں بیان کیا ہے:

"فارس کا ایک بادشاہ جب کسی عورت سے شادی کرتا اور اس کے ساتھ رات بسر کرتا تو اگلے دن اسے قتل کرا دیا کرتا تھا۔ایک بار اس نے شہرزاد نامی ایک شہزادی سے شادی کی جو بہت ذہین اور عقلمند تھی۔وہ رات کے گذرنے تک اس طرح مسلسل گفتگو کرتی رہی کہ بادشاہ کو اس کو مجبوراً زندہ رکھنا پڑا تا کہ اگلی رات میں اس کی کہانی مکمل ہو سکے، یہاں تک کہ ایک ہزار راتیں گذر گئیں، اس مدت میں وہ ایک بچے کی ماں بن گئی۔شہزادی نے بادشاہ کو اپنی تدبیر سے آگاہ کیا اور اس طرح اس کی عقل مندی سے بادشاہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور اسے قتل نہیں کیا، بادشاہ

اليهـا، واستبـقـاها. وكان للملك قهرمانة يقال لها "دينار زاد"، فكانت موافقة لها على ذلك. وقد قيل ان هـذا الكتـاب تـأليف لحـمـانـي (الـصـحيـح: لهـمـا) ابنة بهمن". (كتـاب الـفهـرس صحيفة ۳۰۳ مـن الـنسخة المطبوعة فی أوربا).

ثم قال ابن النديم بُعيد ذلک: "ان أول مـن سـمر بالليل الاسكندر، و كـان لـه قوم يضحكونه. واستعمل لذلک بعده الملوک كتاب "هزار أفسـان"، ويحتوی علی ألف ليلة و علی دون المائتی سمر؛ لأن السَّمَر ربما حدث به فی عدة ليال. وقد رأيته بتـمـامـه دفـعـاتٍ، وهـو بالحقيقة كتاب غثٌّ بارد الحديث".

وقـال المسعودی فی كتاب "مـروج الذهب" فی ذكر الهياكل الـعـظيـمة: "و قـد ذكـر كـثير من الـنـاس أن هـذه أخبار موضوعة من خـرافـات مـصـنـوعة نظمهـا من

کی ایک ملازمہ تھی جس کا نام دینار زاد تھا وہ بھی اس کی تائید میں تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ کتاب حمانی [صحیح: ہما] بنت بہمن کی تالیف ہے۔

(کتاب الفہرست ص۳۰۳ مطبوعہ یورپ)

اس کے بعد ابن ندیم نے یہ بھی لکھا ہے کہ رات میں قصہ گوئی کا آغاز سکندر نے کیا، اس نے کچھ لوگوں کو ہنسنے ہنسانے پر مامور کر رکھا تھا اور اسی مقصد کے لئے اس کے بعد بادشاہوں نے اس کتاب (ہزار افسانہ) کو استعمال کیا اور یہ کتاب ایک ہزار اور دو سو سے کچھ کم قصوں پر مشتمل ہے، کچھ قصے کئی راتوں میں مکمل ہوتے۔ میں نے مکمل کتاب کئی بار دیکھی ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک کمزور اور بے لطف کتاب ہے۔

مسعودی نے مروج الذہب میں ہیاکل عظیمہ کہ ذکر میں لکھا ہے کہ: بہت سے لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ گڑھے ہوئے خرافاتی قصے ہیں جن کو بادشاہوں سے تقرب حاصل کرنے کے لئے مرتب کیا

تقرَّب للملوک بروايتها، وأن سبيلها سبيل الكتب المنقولة الينا و المترجمة لنا من الفارسية والهندية والرومية مثل كتاب "هزار افسانه" و تفسير ذلک من الفارسية،الى العربية:ألف خرافة . والخرافة بالفارسية يقال لها: "أفسانه"(۲) والناس يسمون هذا الكتاب "الف ليلة و ليلة". وهو خبر الملک و الوزير و ابنته و جاريتها شهرزاد و دينار زاد". ثم انهم لم يكتفوا بذلک القدر، بل وضعوا أسمارًا عديدة على حذائه. قال ابن النديم البغدادى: "وابتدأ أبو عبدالله محمد بن عبدوس الجَهشيارى صاحب "كتاب الوزراء" بتأليف كتاب اختار فيه ألفَ سمَرٍ من أسمار العرب و العجم والروم وغيرهم، كلُّ جزءٍ قائمٌ بذاته لا يعلق بغيره، وأحضر المسامرين، فأخذ عنهم أحسن ما

گیااور یہ کتاب فارسی اور ہندی اور رومی زبانوں سے ترجمہ کی گئی کتابوں جیسی ہے جیسے کتاب 'ہزار افسانہ' عربی میں اس کا ترجمہ ہوگا: "ألف خرافة" خرافہ کوفارسی میں افسانہ کہتے ہیں۔اورلوگ اس کتاب کو الف لیلہ ولیلہ کہتے ہیں اور یہ بادشاہ اور وزیراوراس کی بیٹی اور لونڈی شہزاد اور دینارزاد کی کہانی ہے۔

عربوں نے اسی پر اکتفانہیں کیا بلکہ اس طرز پر کچھ نئی داستانیں بھی گڑھی ہیں، ابن ندیم بغدادی نے لکھا ہے کہ:

"ابوعبداللہ محمد بن عبدوس الجہشیاری مصنف کتاب الوزراء نے ایک کتاب مرتب کی جس میں عرب وعجم اورروم وغیرہ کے ایک ہزار قصوں کا انتخاب کیا جس کا ہر حصہ دوسرے سے علاحدہ ہے۔ پھر اس نے قصہ گویوں کوجمع کیا اورعمدہ عمدہ قصے جووہ جانتے تھے وہ لئے اور قصہ کی کتابوں میں جوواقعات اسے بہتر لگے ان کا انتخاب کیا، وہ بڑا فاضل تھا، چنانچہ اس نے ۴۸۰ قصے جمع کئے اور ہر قصہ پچاس ورق پر مشتمل ہے، میں نے اس کے کچھ اجزا

يعرفون و يحسنون، واختار من الكتب المصنفة في الأسمار والخرافات ما يحلى بنفسه. وكان فاضلاً، فاجتمع له من ذلك أربعمائة ليلة و ثمانون ليلة، كلُّ ليلة سمَر تامّ، يحتوى على خمسين ورقة. ورأيت من ذلك عدة أجزاء بخط أبي الطيب أخي الشافعي. و كان قبل ذلك من يعمل الأسمار والخرافات على ألسنة الناس والطير والبهائم جماعة. منهم عبداللّٰه بن المقفع، وسهل بن هارون، و علي بن داود كاتبُ زبيدة وغيرهم" .

فيظهر من هذا كله أن الكتاب أصله فارسي، وأن ما توهَّمه بعض الأجانب بأنه يوناني وهم باطل لا يرجع الى مستند، فان التخمين والقياس غيرُ مُغنٍ عند وجود النصوص الظاهرة. أما الأصول الموجودة من هذا الكتاب، فلا

شافعی کے بھائی ابوالطیب کے قلم سے لکھے ہوئے دیکھے۔ اس سے پہلے بھی انسانوں، پرندوں اور جانوروں کی زبان سے قصے بیان کرنے والوں کی ایک جماعت تھی جس میں عبداللہ ابن مقفع، سہل بن ہارون اور زبیدہ کے منشی علی ابن داؤد وغیرہ شامل تھے۔"

ان تمام تفصیلات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اصلاً فارسی سے منقول ہے اور بعض غیر ملکیوں کو جو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ یہ یونانی الاصل ہے وہ صحیح نہیں بلکہ صرف ظن وتخمین ہے جن کی کوئی اصل بنیاد نہیں۔ ٹھوس دلیلوں کے سامنے ظن و قیاس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس قصے کی جو اصل ہے وہ تو فارسی ہے۔ ہاں اس میں الحاقات بہت ہوئے ہیں اور غالبًا یہ الحاقات جہشیاری وغیرہ کی اس نوع کی کتابوں سے کئے گئے ہیں۔ آپ کے موقر رسالہ الہلال میں فاضل مراسلہ نگار حکمت بک شریف نے جو یہ بات کہی ہے کہ اس میں متعدد مقامات پر قہوے کا ذکر آیا ہے جب کہ قہوہ اس زمانہ میں موجود نہیں تھا تو یہ

شک انه وقع فيها الحاقات، ولعلها
من نسخة الجهشياري أو غير. من
مؤلفي الكتب على حذائه.

أما ما قاله حضرة مراسلكم في
الهلال الأغرِّ حكمت بک شريف
أنه جاء في عدة مواضع منها ذكر
القهوة مع أن القهوة لم تكن في
ذاک الزمان، فمردود بأن القهوة
تُستعمل قديماً بمعنى الخمر، كما
هو مشهور.

شبلي النعماني

على كده من بلاد الهند

بات درست نہیں ہے ۔قہوہ کا لفظ قدیم
زمانہ میں شراب کے معنی میں استعمال
ہوتا تھااور یہ مشہور بات ہے۔

شبلی نعمانی

(علی گڑھ۔ہندوستان)

(الانتقاد ص ۱۸۵-۱۹۰ مرتبہ ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی، مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۲۰۱۵ء بحوالہ الہلال، العدد ۷، دسمبر ۱۸۹۵م، ص ۲۵۲-۲۵۴)

تعلیقات وحواشی

علامہ شبلی کے عالم عربی سے گہرے روابط تھے۔مصرو بیروت وغیرہ سے عربی اخبارات و رسائل الہلال، المناراور المقتطف وغیرہ ان کے پاس آتے تھےاور یہ رسائل ان کے مضامین ومراسلات بڑےاہتمام سے شائع کرتے تھے۔زیرنظر مراسلے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی عالم عرب کے اہل علم اوران کے افکار سے واقفیت رکھتے تھے۔یہ مراسلہ ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی صاحب کے ہاتھ لگا اگر کوئی شخص کوشش کرے تو علامہ کی مزید عربی تحریریں دریافت ہوسکتی ہیں۔

(۱) حکمت بک شریف ۱۸۶۸ء میں طرابلس [لبنان] میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۸ء میں انتقال

کیا۔عربی زبان کے علاوہ ترکی، فارسی، اردو اور فرنچ سے بھی واقف تھے۔ایک مصلح، مورخ، ادیب اور صحافی کے طور پر مشہور ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں ''الرغائب'' کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا جو بہت مقبول ہوا۔مختلف موضوعات پر پچاس سے زیادہ کتابیں لکھیں جن میں سب سے اہم ''تاریخ طرابلس الشام'' ہے۔ادبی کتابوں میں قصیدہ بانت سعاد کی شرح ''سعادۃ المعاذ''، لامیۃ العجم کی شرح ''قصاری الہمم'' اور لامیۃ ابن الوردی کی شرح ''النفح الوردی'' قابل ذکر ہیں۔کئی سفر نامے بھی لکھے جن میں جاپان اور زنجبار کے علاوہ تبت کا سفر نامہ مشہور ہوا۔علامہ شبلی نے مذکورہ بالا مراسلہ انہیں کے مراسلہ کے جواب میں لکھا ہے۔

(۲) الہلال میں قلابین کی عبارت کی جگہ یہ الفاظ چھپے ہیں: ''**أفسان وتغير ذلک من الفارسية و يقال له أفسانه.**'' یہ عبارت غلط بھی ہے اور ناقص بھی۔

[۳]

عبداللہ ابن المقفع کا قبول اسلام

حضـرة الفـاضـل منشئ الهلال الأغر:

وقـفت على مباحثات جرت بيـن ”الـمـقـتـطف“ و بيـن بـعـض مـكـاتبيه في شأن اسلام عبدالله بن المقفع الكاتب الطائر الصيت.

وايم الله ما كنت أحسب أن مسألة مثل هـذه تـكـون مـعتـركاً لأبطال الأدب و دريةً لسهام الأفكار.

وكـلُّ مـا فـي هـذه الـمباحثات من طـرق الاستـدلال و وجـوه الحجج فهـي عـجـائـب بعضها فوق بعض. كيف لا وأن فاضلاً كحضرة الأمير شكيب أرسلان تخفي عنه نصوص ابـن خـلّـكـان، وانَّ حكيماً كالأب

محترم بانی مدیر مجلّہ الہلال

مجھ کو ان بحثوں سے واقفیت حاصل ہوئی جو المقتطف اور اس کے مقالہ نگاروں نے مشہور زمانہ انشا پرداز عبداللہ ابن المقفع کے اسلام لانے کے متعلق کی ہیں۔

بخدا مجھ کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ مسئلہ بھی نامور ادباء کے درمیان معرکہ آرائی کا موضوع بن سکتا ہے۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اس باب میں جو طریقہ استدلال اختیار کیا گیا ہے وہ اور بھی حیرت ناک ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب امیر شکیب ارسلان (۱) جیسے نامور فاضل کی نگاہوں سے ابن خلکان کی عبارتیں پوشیدہ رہ جائیں اور فادر لوئس شیخو (۲) جیسا دانشور جو حق کو تسلیم کرنے سے گریز کرے اور نسیان کا سہارا لے اور

لويس شيخو يستنكف عن الاذعان للحق، ويدافع بالنسيان والذهول، وأن فيلسوفاً كصاحب المقتطف يحتجُّ على نصرانية عبداللّٰه بن المقفع بأنه كان متهماً بالزندقة، وأن الزندقة هي المجوسية، وأن المجوس أكثرهم تنصَّروا أو مالوا الى النصرانية.

ونحن نكشف عن جلية الحال، حتى لا يبقى لأحد مقال. فأما اسلام عبداللّٰه بن المقفع، فلسنا نحتاج في اثباته الى نصوص المتأخرين كابن خلكان وأمثاله. فذلك ابن النديم الذي هو في الرعيل الأول من قدماء المؤرخين نصَّ على اسلامه في كتابه "الفهرست" فقال:

"اسمه بالفارسية روزْبه، وهو عبداللّٰه بن المقفع، و يكنى قبل اسلامه أبا عمرو، فلما أسلم تكنَّى بأبي محمد".

وقال الشريف المرتضى عَلَم الهدى

المقتطف کے ایڈیٹر(۳) جیسا فلسفی محض زندقہ کے اتہام کی بنا پر ابن المقفع کو نصرانی بتانے لگے اور یہ کہنے لگے کہ زندقہ دراصل مجوسیت کا نام ہے اور اکثر مجوسیوں نے یا تو عیسائیت اختیار کر لی یا عیسائیت کی طرف مائل ہو گئے۔

ہم یہاں اصل حقیقت بیان کرتے ہیں تاکہ پھر کسی شبہے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ عبداللہ بن المقفع کے اسلام لانے کے بارہ میں ہم کو ابن خلکان جیسے متاخرین کی عبارتوں کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ قدیم مورخین میں صف اول کے مصنف ابن الندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں اس امر کی صراحت کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"فارسی میں اس کا نام روزبہ تھا اور یہی شخص عبداللہ ابن المقفع ہے۔ اسلام لانے سے پہلے اس کی کنیت ابوعمرو تھی۔ اور اسلام کے بعد اس کی کنیت ابومحمد ہو گئی۔"

شریف مرتضٰی نے اپنی کتاب الدرر والغرر میں لکھا ہے:

فـي كتابه "الدرر والغرر": "وروى ابـن شبَّة قـال: حدثني مَن سمع ابنَ الـمقفع و قد مرَّ ببيت نار للمجوس بعد أن أسلم فَلَمحه و تمثَّل".

وقال الصغاني في "العباب": "عبدالـلّـه بـن المقفع كان فصيحاً بـليـغـاً، وكـان اسـمه روزبه. وكان قبل اسلامه يكتني بأبي عمرو، فلما أسـلم تسمَّى بعبداللّٰه، وتكنى بأبي مـحـمـد". وفـي كـنيتـه ما يغني عن الـمبـاحـث كـلِّهـا، فهل سمعَت نصرانياًيكتني بأبي محمد؟

فـأمـا اتهـامــه بـالـزندقة، فلـه أسوة بـكثيــر مـن سـلاطيـن الـملة الذين كـانـوا زعـماء الأدب، وبهم قامت دعـائـم الـعـلـم. قـال ابن النديم في كتـابـه " الفهرست": "ذكرُ ما كان يُـرمَـى بـالـزنـدقة مـن الملوك والـرؤسـاء: قيـل: ان البـرامـكة بـأسـرهـاالا مـحـمـد بن خـالد بن بَرمک كانت زنادقة. وكان محمد

''ابن شبہ روایت کرتے ہیں کہ ابن المقفع سے سن کر مجھ سے ایک شخص نے بتایا کہ اسلام لانے کے بعد ابن المقفع مجوسیوں کے آتش کدے کے پاس سے گذرا تو اس پر نظر ڈالی اور (احوص کا یہ) شعر پڑھا۔''

صغانی نے العباب میں لکھا ہے کہ'' عبداللہ ابن المقفع فصیح و بلیغ تھا۔ اور اسلام سے پہلے اس کا نام روزبہ تھا اور کنیت ابوعمرو تھی۔ اسلام لانے کے بعد اس کا نام عبداللہ رکھا گیا اور کنیت ابومحمد قرار پائی۔'' اس کی کنیت خود اس امر میں ایک فیصلہ کن امر ہے، کیا آپ نے کسی عیسائی کی کنیت ابومحمد کبھی سنی ہے؟

جہاں تک معاملہ زندقہ کے اتہام کا ہے تو اس میں ابن المقفع تنہا نہیں ہے، اس کے ساتھ بہت سے فرماں روا بھی ہیں جو علم وادب کے امام تھے۔ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں زندقہ کے الزام سے متہم بادشاہوں اور امراء کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

کہ محمد بن خالد بن برمک کے

بن عبيدالله كاتب المهدى زنديقاً. واعترف بذلک، فقتله المهدى. قرأت بخط بعض أهل المذهب بأن المأمون كان منهم (وكذب فى ذلک)" انتهى ما قاله ابن النديم.

علاوہ جتنے بھی خاندان برامکہ کے فرد تھے سب زندیق تھے، مہدی کا منشی محمد بن عبداللہ بھی زندیق تھا اور جب اس نے اس کا اقرار کیا تو مہدی نے اس کی گردن اڑا دی۔ میں نے بعض زنادقہ کے قلم سے لکھا دیکھا ہے کہ مامون بھی اسی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ [یہ جھوٹ ہے]

والسرُّ فى ذلک أن أهل القرن الأول من الاسلام و كذلک الثانى كانوا يكرهون الفلسفة والعقليات الا الخواصَّ منهم. فكلُّ من كان له مزيد اعتناء و ميل مفرط الى العلوم العقلية كانت العامة ترميهم بالزندقة. وزِدْ على ذلک أن ابن المقفع كان ترجم كثيراً من كتب زنادقة المجوس، كما صرّح به المسعودى فى كتابه "مروج الذهب".

اصل بات یہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی دوصدیوں میں عام طور پر فلسفہ اور عقلی علوم کو ناپسند کیا جاتا تھا، پس جس شخص کا زیادہ میلان اور توجہ ان علوم کی طرف لوگ دیکھتے تھے اس کو زندیق کہہ کر پکارتے تھے۔

ابن المقفع کا معاملہ یہ بھی ہے کہ اس نے بہت سے مجوسی زندیقوں کی کتابوں کے ترجمے بھی کئے، جیسا کہ مسعودی نے مروج الذہب میں صراحت کی ہے۔

فأما ما استدل به صاحب "المقتطف" من أنه ترجم الكتب اليونانية فهذا لم يكن لأجل ميله الى النصرانية، ولايستدل به على معرفته

المقتطف کے ایڈیٹر کی یہ دلیل کہ اس نے یونانی کتابوں کے ترجمے کئے جس سے اس کی نصرانیت کا پتہ چلتا ہے، یہ بھی صحیح نہیں ہے اور اس سے یونانی زبان سے اس کی واقفیت پر بھی استدلال نہیں کیا

باللسان اليوناني؛ فان الكتب التي ترجمها، انما ترجمها من تراجمها التي كانت بالفارسية، لا من أصلها اليوناني. قال صاحب "كشف الظنون" تحت لفظ الحكمة:

"وكانت الفرس نقلت في القديم شيئاً من كتب المنطق والطب الى اللغة الفارسية، فنقَل ذلك الى العربي عبدُالله بن المقفع وغيره".

ولذلك جعله ابن النديم وغيره في عداد النقَلة من الفارسي الى العربي. طالع كتاب "الفهرست" صحيفة ٣٣٣

شبلي نعماني

على كده، من بلاد الهند

أحد أعضاء الكلية البريطانية

في الهند

جا سکتا کیونکہ اس نے جن یونانی کتابوں کا ترجمہ کیا وہ اصل یونانی سے نہیں بلکہ ان کے فارسی ترجمے سے کیا ہے۔

صاحب کشف الظنون لفظ حکمت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''ایرانیوں نے قدیم زمانہ میں منطق اور طب کی کچھ کتابیں فارسی میں ترجمہ کی تھیں پھر ان کتابوں کو عبداللہ بن المقفع وغیرہ نے عربی میں منتقل کیا۔''

اسی بنا پر ابن الندیم وغیرہ نے اس کو فارسی سے عربی میں ترجمہ کرنے والوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ دیکھئے کتاب الفہرست ص۳۳۳

شبلی نعمانی

علی گڈھ

استاد برطانوی کالج

ہندوستان

(الانتقاد ص۱۹۲-۱۹۵ بحوالہ الہلال، العدد ۱۷، ۱۵ یونیو ۱۹۰۰ م، ص۵۵۹-۵۶۰)

تعلیقات وحواشی

(۱) امیر شکیب ارسلان [۱۸۶۹-۱۹۴۶ء] اپنے عہد کے عربی زبان کے ممتاز ادیب وانشا پرداز تھے، مفتی محمد عبدہ اور جمال الدین افغانی سے بے حد متاثر تھے۔ لبنان میں پیدا ہوئے۔ اپنے بعض افکار و

خیالات کی وجہ سے جلاوطن کئے گئے اور پچیس سال جلاوطنی کی زندگی گذاری۔۹؍دسمبر ۱۹۴۶ءکواپنے وطن میں عارضہ قلب میں وفات پائی۔

انہوں نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں۔حاضر العالم الاسلامی، الحلل السندسیہ فی الاخبار و الآثار الاندلسیہ [تین جلدیں] الارتسامات اللطاف فی خاطر الحاج الی اقدس مطاف، شوقی و صداقۃ اربعین سنۃ ان کی اہم تصانیف ہیں۔ان کے علاوہ متعدد کتابوں کے انہوں نے ترجمے بھی کئے اور کئی کتابوں کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ (الاعلام ج۳ص۱۷۵-۱۷۳)

(۲) لویس شیخو [۱۸۵۹-۱۹۲۷ء/۱۲۷۵-۱۳۴۶ھ] مذہباً عیسائی تھے۔جزیرہ الفراتیہ میں پیدا ہوئے۔لبنان میں تعلیم حاصل کی، پھر بیروت آ گئے۔مدۃ العمر علم وتحقیق سے شغف رہا۔ان کے قلم سے متعدد کتابیں نکلیں، چند کے نام یہ ہیں:

۱۔المخطوطات العربیة لکتبة النصرانیة

۲۔معرض الخطوط العربیہ

۳۔مجانی الادب

۴۔شعراء النصرانیہ

۵۔علم الادب

۶۔الآداب العربیہ فی القرن التاسع عشر

۷۔الآداب العربیہ فی الربع الاول من القرن العشرین

۸۔شرح دیوان الخنساء

۱۹۲۷ء میں بیروت ہی میں لوئس شیخو کا انتقال ہوا۔

(ویکی پیڈیا)

(۳) ڈاکٹر یعقوب صروف [۱۸۵۲-۱۹۲۷ء/۱۲۶۹-۱۳۴۶ھ] بڑے عالم فاضل شخص تھے۔عربی ادب پر گہری نگاہ تھی۔متعدد کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ مجلّہ المقتطف کا

۱۸۷۶ء میں اجراء ہے۔ وہ اپنے علمی، تحقیقی، حکیمانہ، فلسفیانہ مشمولات کی وجہ سے اہل علم اور ارباب کمال کے درمیان مقبول رہا۔

ڈاکٹر یعقوب صروف ۱۸۵۲ء میں لبنان میں پیدا ہوئے اور ۵/ جولائی ۱۹۲۷ء کو بیروت میں انتقال کیا۔ (ریاست علی ندوی، ماہنامہ معارف ستمبر ۱۹۲۷ء ص ۲۲۱-۲۲۲)

[۴]

ابن رشد

جناب اڈیٹر صاحب (۱)

میں نے اخبار آزاد (۲) مطبوعہ ۱۶/نومبر ۱۸۸۸ء میں وہ ریویو پڑھا تھا جو آپ ''المامون'' (۳) پر نہایت قابلیت سے لکھ رہے ہیں۔ اس ریویو میں آپ نے مثالاً ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے، جو آپ کے نزدیک مسلم اور بدیہی الثبوت بن گیا ہے، یعنی یہ کہ امام ابوالولید ابن رشد (۴) جو مسلمانوں میں ارسطو کا ہم پلہ تھا، اسلامی تاریخ میں ایک گم شدہ شخص ہے۔ ۱۲/اکتوبر ۱۸۸۸ء کے پرچہ میں بھی آپ نے اس کو مثالاً پیش کیا ہے اور جہاں تک مجھ کو یاد ہے ایک اور پرچہ میں بھی آپ نے اس واقعہ کو عبرت انگیز صورت میں دکھایا ہے۔

مسٹر سید حسن بلگرامی المخاطب بہ عماد الدولہ (۵) کا وہ مضمون جو ''ابن رشد اور اس کے معاصرین'' پر ہے، جب اول اول اخبار اردو گائڈ (۶) میں چھپا تو اس وقت مجھ کو گمان ہوا کہ اس خاص امر کی نسبت وہ بہت سے لوگوں کے لیے غلطی میں پڑنے کا باعث ہوگا۔ آپ مجھے معاف فرمایئے گا، اگر میں یہ کہوں کہ اس دام میں پہلے پھنسنے والے آپ تھے۔ مسٹر عماد الدولہ کے یہ الفاظ ہیں ''افسوس ہے کہ ایسے بڑے حکیم کا نام تک ہمارے یہاں کسی کو معلوم نہیں ہے، نہ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں نہ ابن خلکان (۷) نے وفیات الاعیان میں اس حکیم کا ذکر کیا ہے۔ غرض کہ ابن رشد کا اگر چہ ہماری مشرقی کتابوں میں کسی نے نام تک بہ مشکل لکھا ہے، ابن رشد کی تصنیفات بہ کثرت ہیں، اگر چہ کوئی ایک بھی ان

میں سے ہمارے ہاتھ میں موجود نہیں ہے۔ابن رشد کی اصل کتابیں ہی مفقود ہیں۔عربی سے عبری اور عربی سے لاطینی میں جس قدر ترجمہ ہوئی تھیں یورپ کے کتب خانوں میں دستیاب ہوتی ہیں''۔

ان مکرر اور واضح تصریحات سے اگر آپ نے خیال فرمایا کہ مسلمانوں کی علمی دنیا میں ابن رشد ایک گمنام شخص ہے تو چنداں تعجب نہیں لیکن میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ عماد الدولہ بہادر کی پیروی کر کے اسلام کی تاریخی وسعت کی نسبت بدظن نہ ہوجیے۔علامہ مقریزی تاریخ نفح الطیب میں ابن رشد کو فلسفہ کا امام بتاتے ہیں۔(دیکھو نفح الطیب مطبوعہ فرانس ۱۸۶۱ء جلد ثانی ص ۱۲۵)

معجب فی تلخیص اخبار المغرب میں ابن رشد کا مفصل تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ بادشاہ کے ایما سے اس نے تمام تصنیفات ارسطو کا ایک جامع خلاصہ لکھا ہے، جو ایک سو پچاس جز میں تھا (المعجب فی تلخیص اخبار المغرب ص ۲۲۴ مطبع بریل، لیڈن، ۱۸۸۱ء)

خلیفہ ناصر لدین اللہ عباسی کے زمانہ میں جن مشہور علما نے انتقال کیا، ان کی فہرست میں حافظ جلال الدین سیوطی (۸) ابن رشد کا نام ان لفظوں سے لکھتے ہیں ''صاحب العلوم الفلسفیہ'' (تاریخ الخلفاء، سیوطی، ص ۴۶۹)

صاحب کشف الظنون نے اس کے متعدد تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔(دیکھو تہافتہ الفلاسفہ و کتاب الکون والفساد کے تحت میں کیا۔(کشف الظنون فصل التاء مع الھاء، ج ا، ص ۳۴۹، مطبعۃ العالم، ۱۳۰۰ھ)۔اس پر عماد الدولہ کے اس حصر کو تسلیم کریں گے؟ یافعی نے فقط اس قدر لکھا ہے کہ ''۵۹۵ھ میں اس نے وفات پائی۔'' عماد الدولہ تو ابن رشد کے تمام تصنیفات کو ناپید بتاتے ہیں، لیکن اس کی تین معتمد تصنیفیں تو خود ہمارے استعمال میں ہیں یعنی تہافتہ الفلاسفہ امام غزالی (۹) کا رد (مطبوعہ مطبع اعلامیہ، مصر، ۱۳۰۲ھ) اور فصل المقال و کتاب الکشف عن مناہج الادلہ (مطبوعہ جرمنی، مقام سوچین، ۱۸۵۹ء)۔آپ کی

طرح میں بھی عماد الدولہ بہادر کی علمی قابلیت کا بہت ادب کرتا ہوں، لیکن اس گستاخی پر جس چیز نے مجبور کیا وہ یہ ہے کہ ان کی تحریر مسلمانوں کی تاریخی واقفیت پر ایک بیجا حملہ ہے۔

(آزاد، لکھنؤ، ۷؍دسمبر ۱۸۸۸ء)

تعلیقات وحواشی

جیسا کہ مراسلہ سے واضح ہے کہ شوق قدوائی ایڈیٹر اخبار آزاد اور سید حسین بلگرامی کی تحریروں سے یہ واضح ہو رہا تھا کہ ابن رشد کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے اور بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ اس کی تردید کے لئے علامہ شبلی نے یہ مراسلہ لکھا۔ بعد میں الندوہ کی ادارت کے زمانہ میں ابن رشد پر انہوں نے ایک مستقل مضمون لکھا (ماہنامہ الندوہ، لکھنؤ، رجب المرجب، ۱۳۲۲ھ ص ۱-۲۸) جو غالباً اردو میں ابن رشد پر پہلا بھرپور مضمون ہے۔

(۱) شوق قدوائی: شیخ احمد علی شوق قدوائی [م: ۲۷؍اپریل ۱۹۲۵ء] ایڈیٹر اخبار آزاد لکھنو، کہنہ مشق ادیب وشاعر تھے۔ مثنوی کہنے میں خاص مہارت تھی۔ انہوں نے متعدد مثنویاں لکھیں۔ ترانہ شوق اور عالم خیال کے چار رخ وغیرہ ان کی یادگاریں ہیں۔

ان کا اخبار آزاد ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۰ء کے درمیان لکھنؤ سے نکلتا رہا اور اپنے عہد کے ادباء و شعراء کی خاص توجہ کا مرکز رہا۔ اب اس کے شمارے کہیں دستیاب نہیں۔ (یادرفتگاں از سید سلیمان ندوی)

(۲) اخبار آزاد: یہ اخبار لکھنو سے ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۰ء کے درمیان نکلتا رہا۔

(۳) المامون: علامہ شبلی کی معروف کتاب مطبوعہ ۱۸۸۸ء

(۴) ابوالولید ابن رشد [۱۱۲۶-۱۱۹۸ء] نامور فلسفی اور طبیب اور اپنے عہد کا یگانہ روزگار شخص تھا۔ قرطبہ میں پیدا ہوا۔ اشبیلیہ اور قرطبہ کا قاضی رہا۔ متعدد کتابیں اور شرحیں لکھیں۔ انہیں اندلس کا سب سے بڑا عرب فلسفی تسلیم کیا جاتا ہے۔ (دیکھیں علامہ شبلی، مقالات شبلی، ج ۵، ص ۲۵-۶۸)

(۵) غالباً سہو کتابت سے سید حسین کی جگہ سید حسن بلگرامی ہو گیا ہے۔ اصل نام سید حسین بلگرامی

ہے۔ اسی طرح عمادالملک کے بجائے عمادالدولہ بھی سہو کتابت ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ جس مضمون کا مراسلہ میں ذکر ہے وہ مسٹر سید حسین بلگرامی المخاطب بہ عمادالملک کے مجموعہ مقالات ''رسائل عمادالملک'' میں شامل ہے۔

عمادالملک سے علامہ شبلی کے بڑے گہرے مراسم اور خط و کتابت تھی۔ آخر عمر میں علامہ شبلی کی ایما سے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ شروع کیا تھا جو دس پاروں تک پہونچا تھا کہ ان کا آخری وقت آ پہونچا اور یہ کام ناتمام رہا۔ اس نامکمل ترجمہ کا بھی کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ (حیات شبلی، ص ۷۲۲)

(۶) اخبار اردو گائڈ: یہ اخبار کلکتہ سے شایع ہوتا تھا۔

(۷) ابوالعباس شمس الدین احمد بن ابراہیم معروف بہ ابن خلکان [۱۲۱۱-۱۲۸۲ء] مشہور مورخ گذرا ہے۔ وفیات الاعیان اس کا عظیم تصنیفی کارنامہ ہے۔ اصلاً حوالہ کی کتاب ہے۔ ابن خلکان اربیلہ میں پیدا ہوئے۔ خاندان برامکہ کے چشم و چراغ تھے۔ اربیلہ اور دمشق میں تعلیم حاصل کی۔ ابن شداد اور ابن یعیش کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ تحصیل علم کے بعد قاہرہ وارد ہوئے، پھر دمشق کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ فقہ، تاریخ اور شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق تھا۔ ۳۰/اکتوبر ۱۲۸۲ء کو دمشق میں وفات پائی۔

(دیکھیں اردو دائرۃ معارف اسلامیہ لاہور، ج ا، ص ۵۰۸-۵۱۰)

(۸) جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی [۸۴۹-۹۱۱ھ] مشہور عالم و مورخ، جامع علوم و فنون اور کثیر التصانیف اہل قلم تھے۔ بروکلمان نے ان کی کتابوں کی تعداد ۴۱۵ر لکھی ہے جبکہ فلوگل نے ان کی تصنیفات کی تعداد ۵۶۱ر لکھی ہے۔ ایک روایت ۵۷۶ر کی بھی ہے۔ تفسیر جلالین، تفسیر الاتقان، الجامع الصغیر، المزہر، شرح شواہد المغنی، حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ، تاریخ الخلفاء، بغیۃ الوعاۃ وغیرہ ان کی معرکۃ الآراء تصانیف ہیں۔ علامہ سیوطی قاہرہ میں پیدا ہوئے اور قاہرہ ہی میں ۹۱۱ھ میں وفات پائی۔

(دیکھیں تذکرہ علامہ جلال الدین سیوطی از ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی)

(۹) امام محمد بن محمد غزالی [م: ۵۰۵ھ] فلسفہ و تصوف کے امام تھے۔ تفصیل کے لئے دیکھیں الغزالی مصنفہ علامہ شبلی نعمانی۔

[۵]

المامون

جناب من!

آپ(۱) کے متواتر خطوط پہنچے کہ میں ان تحریرات کی طرف متوجہ ہوں جو المامون کے متعلق اخبار آزاد میں شایع ہوئیں۔ بے شبہ آپ کا مقصود صرف یہ ہے کہ امر حق فیصل ہو جائے، لیکن افسوس ہے کہ نہ مجھ کو فرصت اور نہ اس قدر عام رائیں لحاظ کی مستحق ہیں۔ آج کل جس کے ہاتھ میں قلم ہے وہ نچلا نہیں بیٹھ سکتا، میں کس کس کی طرف توجہ کروں گا۔ آپ کو بہت بڑا شبہ یہ پیدا ہوا ہے کہ دولت عباسیہ میں رشید(۲) انتخاب کے قابل تھا نہ کہ مامون۔ ریویو لکھنے والوں نے بھی اس بات کو زیادہ طول دیا ہے۔ اس امر اور تمام دوسرے اعتراضات کا تصفیہ وہ شخص کر سکتا ہے جس نے نہایت وسعت کے ساتھ تاریخی معلومات فراہم کیے ہیں اور ساتھ ہی باریک بیں اور تاریخی اصول کا نکتہ شناس بھی ہو۔ رشید کے تمام کارنامے کس کی نظر میں ہیں؟ ''المامون'' اور چند معمولی کتابوں سے جو واقفیت حاصل کی گئی ہے وہ رشید پر رائے دینے کے لیے کافی نہیں ہے، نہ کہ موازنہ جو بڑی تحقیق و تدقیق کا نتیجہ ہے۔ ''المامون'' میں رشید کا تذکرہ ضمناً آ گیا ہے اور جس قدر لکھ دیا گیا ہے وہی مناسب تھا۔ رشید کی برائیاں لوگوں نے صرف برامکہ پر محدود و خیال کیں اور اس بنا پر مامون سے موازنہ کرنے کو طیار(۳) ہو گئے۔ مامون کی جس قدر غلطیاں اور برائیاں لوگوں نے گنائی ہیں اس کے مقابل میں رشید کے اور تمام کارنامے موجود ہیں۔ برامکہ(۴)

کا واقعہ رشید کے الزامات کے پلہ کو بھاری کر دیتا ہے۔ اگر چہ مجھ کو زیبا نہیں کہ میں مرحوم ہارون الرشید کی فردقرارداد جرم تیار کروں، لیکن اگر ہمارے دوستوں کے خزانہ معلومات میں المامون اور تاریخ الخلفاء کے سوا اور بھی کچھ ہے تو خیال کریں کہ وہ کون تھا جس نے سرحدی شہروں کے تمام گرجے بعض بیجا تعصب سے منہدم کرا دئے؟ کون تھا جس نے اپنے قید خانہ کو بعض شبہ کی بنا پر حضرت موسیٰ کاظم سے آباد کیا تھا؟ کون تھا جس کے درباری اس کی بدمزاجی سے اس قدر خائف رہتے تھے کہ اکثر اس کے پاس کفن پہن کر جاتے تھے؟ کون تھا جس نے حضرت یحییٰ بن عبداللہ کو معاہدہ صلح لکھ دیا جس پر تمام علماء اور بنو ہاشم کے دستخط تھے، پھر بے وجہ ان کو قید کر دیا؟ اور گو امام محمد صاحب نے کہا بھی کہ یہ بالکل اسلام کے خلاف کارروائی ہے، مگر باز نہ آیا۔ کون تھا جس کے عہد میں عمال اور عہدہ داران ملکی علانیہ ظلم کرتے تھے اور سال بھر ایک بار بھی مظلوموں کی فریاد سننے کو دربار نہیں کرتا تھا؟ کون تھا جس کو قاضی ابو یوسف نے نہایت حسرت اور تمنا سے کتاب الخراج میں یوں مخاطب کیا؟

”فلو تقربت الی اللہ عز و جل یا امیر المومنین بالجلوس لمظالم رعیتک فی الشھر او الشھرین مجلسا واحدا تسمع فیہ من المظلوم و تنکر علی الظالم رجوت ان لاتکون ممن احتجب عن حوائج رعیتہ ولعلک لاتجلس الا مجلساً او مجلسین حتی یسیر ذلک فی الامصار والمدن فیخاف الظالم وقوفک علی ظلمہ...... مع انہ متی علم العمال والولاۃ انک تجلس للنظر فی امور الناس یوما فی السنۃ لیس یوما فی الشھر تناھوا باذن اللہ عن الظلم“۔(کتاب الخراج فصل فی تقبیل السواد واختیار الولاۃ الخ ص ۶۳)

”یعنی اگر اے امیر المومنین! تو خدا کا تقرب اس طرح حاصل کرتا ہے کہ رعایا کی فریاد سننے کے لیے مہینہ میں بلکہ دو مہینہ میں ایک اجلاس بھی کرتا جس میں تو مظلوموں کی فریاد سنتا اور ظالم سے باز پرس کرتا تو مجھ کو امید تھی کہ تیرا شمار ان لوگوں میں نہ ہوتا جو رعایا کی

حاجتیں نہیں سنتے اور غالباً تو دو ایک ہی اجلاس کرے گا کہ ملک میں یہ چرچا پھیل جائے گا، پس ظالم کو ڈر پیدا ہوگا کہ اس کے ظلم کی تجھ کو خبر نہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جب عاملوں اور عہدہ داروں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ تو برس دن میں ایک بار بھی لوگوں کی حاجت روائی کے لیے اجلاس کرتا ہے تو وہ لوگ انشاءاللہ ظلم سے باز رہیں گے۔''

کون تھا کہ جس کے عہد میں اکثر واقعہ نویس عمالوں سے سازشیں رکھتے تھے اور بالکل جھوٹ اور فساد انگیز خبریں ہارون الرشید کو لکھتے تھے، جس کی وجہ سے قاضی ابو یوسف نے مجبور ہو کر کتاب الخراج میں اس کا ذکر کیا؟ کون تھا جس کے عہد میں ملک کی تباہی کا یہ حال تھا کہ سواد کے علاقہ میں حضرت عمرؓ نے جو خفیف جمع مقرر کی تھی رعایا اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی اور آخر قاضی ابو یوسف صاحب کو وہ مقدار گھٹا کر اس کی توجیہ کرنی پڑی؟ (ملاحظہ ہو کتاب الخراج، ص ۴۸)۔ کون تھا جس کا خزانہ اس طرح معمور کیا جاتا تھا کہ جب کسی پر کچھ شبہ ہوا تو اس کا کل مال و متاع ضبط ہو کر خزانہ شاہی میں داخل کر دیا گیا۔ علی بن عیسیٰ سے دس کرور درہم چھین کر جو خزانہ میں داخل کیے گئے، کیا جائز حق سے لیے گئے؟ کون تھا جس نے اسلام میں یہ نئی بدعت ایجاد کی کہ خلافت کے چند ٹکڑے کیے اور اپنے بیٹوں میں اس کو موروثی جائداد کی طرح تقسیم کیا؟

کیا ان باتوں کے ہم پلہ مامون کی تاریخ میں بھی مل سکتی ہیں؟ افسوس ہے کہ نہ لوگوں کو تمام حالات سے اطلاع نہ واقعات کے موازنہ کرنے کی قابلیت۔ یہ امور جو میں نے لکھے شاید لوگوں کو چیستاں معلوم ہوں اور تاریخی دفتروں میں اس کے حوالے بھی نہ ڈھونڈ سکیں۔ فتوحات کے لحاظ سے رشید کو کیا ترجیح ہے؟ مختصر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ رشید نے کوئی نیا ملک فتح نہیں کیا، لیکن مامون کے عہد میں صقلیہ اور کریٹ کی جو فتحیں ہوئیں وہ خاص لحاظ کے قابل ہیں۔ علم و قابلیت کے لحاظ سے سب جانتے ہیں رشید صرف ادب و فقہ و حدیث میں کمال رکھتا تھا، لیکن مامون ان علوم کے علاوہ فنون حکمت کے مختلف صیغوں میں ایک حکیم

تسلیم کیا جاتا تھا۔

پھر میں کہتا ہوں کہ رشید کی برائیاں میں نے کم گنائیں۔ رنج ہوتا ہے کہ سینکڑوں برس کے دبے فتنے آج ابھارے جائیں۔ خیر رشید جو کچھ تھا خوب تھا، ان طرف داروں سے اس کا حق مجھ پر زیادہ ہے۔ میں نے کچھ سمجھ کے اس کو نہیں لیا۔ ''المامون'' پر جو نکتہ چینیاں کی گئی ہیں، وہ اسی طرح تفصیل طلب ہیں، جس طرح رشید و مامون کا موازنہ۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی اوقات کو ان فضول باتوں میں صرف کروں۔ آپ یقین فرمائیں کہ مجھ کو کبھی عام لوگوں کی تحسین سے نہ خوشی ہوئی نہ ان کے اعتراض سے رنج۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ اعتراض کریں، آپ کا جی چاہے تو ان کے جواب کی طرف متوجہ ہوں۔ مجھ کو چھوڑ دیجئے کہ ''رائل ہیروز'' کے باقی حصے پورے کروں

رسی آنکہ بدرد من کہ چو من
خامہ گیری و حرف بنگاری

شبلی نعمانی

آزاد، لکھنؤ، ۲۲ر فروری ۱۸۸۹ء

تعلیقات و حواشی

یہ مراسلہ بھی شوق قدوائی ایڈیٹر اخبار آزاد لکھنو ہی کو لکھا گیا ہے۔ علامہ شبلی نے ۱۸۸۸ء میں جب المامون لکھی تو بعض اہل قلم نے یہ اعتراض کیا کہ دولت عباسیہ میں ہارون رشید انتخاب کے لائق شخص تھا، مامون کا انتخاب صحیح نہیں۔ چنانچہ اخبار آزاد لکھنؤ میں کئی مراسلے شائع ہوئے جس میں ایک مراسلہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا بھی تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے مطابق شبلی کا مذکورہ مراسلہ انہیں کے جواب میں ہے جب کہ مراسلہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے یہ مراسلہ تمام معترضین کے جواب میں لکھا ہے۔

(۱) ایڈیٹر آزاد اخبار لکھنؤ

(۲) خلیفہ ہارون رشید

(۳) علامہ شبلی تیار ط سے لکھتے تھے۔

(۴) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''البرامکہ'' از مولانا عبدالرزاق کان پوری

[۶]

رسالہ المعارف

اس رسالے کے جومقاصد واغراض ہیں ان کی زیادہ توضیح کے لئے مناسب ہوگا کہ اس کی تجویز کی ابتدائی تاریخ بیان کی جائے۔ایک مدت سے اکثر مجھ کو یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ اسلامی تاریخ میں بہت سے ایسے کارنامے اور چھوٹے چھوٹے دلچسپ واقعات ہیں جن کے لئے کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی جاسکتی۔ان کو قوم اور ملک کے سامنے لایا جائے تو کس پیرائے میں لایا جائے۔ مثلاً مسلمانوں کے کتب خانے، رسدگاہیں، سفرنامے، تحقیقات طبی، تمدن ومعاشرت۔اس قسم کے اور بہت سے مضامین ہیں جن کے متعلق تفصیلی معلومات کا سرمایہ موجود نہیں اور جس قدر موجود ہے اس پر الگ الگ کتابیں نہیں لکھی جاسکتیں۔

اس بنا پر خیال ہوا کہ ایک ماہواری رسالے سے یہ کام لیا جائے۔ چونکہ ملک میں اس قسم کا مذاق اتنا عام نہ تھا کہ صرف اس محدود عنوان پر کوئی ماہوار رسالہ اشاعت پا سکتا، اس لئے یہ تجویز عمل میں نہ آسکی۔مصر وروم کے سفر میں اس ارادے کو تحریک ہوئی کہ ان ممالک میں جہاں قدیم اسلامی تاریخ کے ذخیرے ڈھونڈھتا رہا، یہ بھی دیکھتا تھا کہ مسلمانوں کی موجودہ تعلیم وتربیت کا کیا نقشہ ہے۔ بہت سی باتیں خود تحقیق کیں اور اکثر اخبارات اور علمی رسالے دیکھے، جن سے یہ امید ہوئی کہ معلومات کا یہ سلسلہ آئندہ بھی قائم رہ سکتا ہے۔یعنی ان ملکوں میں جو تربیت اور طرز تعلیم ہے اور جو کچھ اس میں اصلاحیں اور

ترقیاں ہوتی رہتی ہیں، وہ وقتاً فوقتاً ان اخبارات ورسالوں کے ذریعہ سے معلوم ہوسکتی ہیں۔اس طرح اگر مسلمانوں کی قدیم تاریخ کے ساتھ جدید تاریخ کو بھی شامل کرلیا جائے تو مضمون وسیع ہوجائے گا اوراس کی بناپر ایک مستقل رسالہ کا جاری کرنا بے جا نہ ہوگا۔

ان باتوں پر میرا ارادہ راسخ نہ ہوا تھا لیکن خوش قسمتی سے بعض غیر مترقب اسباب پیدا ہو گئے، جن کے بعد مجھ کو کسی حالت منتظرہ کا انتظار نہ رہا۔مسٹر آرنلڈ (۱) جو ہمارے [علی گڑھ] کالج میں فلاسفی کے پروفیسر ہیں،انگریزی کے سوا یورپ کی کئی زبانیں جانتے ہیں اور چونکہ ایک مدت سے دعوت اسلام پر وہ ایک بہت بڑی کتاب (۲) لکھ رہے ہیں، اس لئے ان زبانوں میں جس قدر تصانیف، اسلام اور تاریخ اسلام کے متعلق ہیں، ان کا بہت بڑا حصہ ان کی نگاہ سے گزر چکا ہے۔صاحب موصوف سے جب میں نے اپنے خیالی رسالے کا تذکرہ کیا تو انہوں نے نہایت آمادگی سے اس کی اعانت کا وعدہ کیا اوراجازت دی کہ ان کا نام رسالہ کے ایڈیٹروں میں شامل کیا جائے۔ان کے ساتھ ہمارے کالج کے سکنڈ ماسٹر میر ولایت حسین صاحب (۳) نے بھی ایڈیٹری قبول کی اوراس طرح مجھ کواس کام میں دونوں بازو مل گئے اور رسالے کو دو سرپرست ہاتھ آ گئے۔حقیقت یہ ہے کہ آج کل یورپ نے اورعلوم وفنون کے ساتھ علم تاریخ کو اس بلند رتبہ پر پہونچا دیا ہے کہ کوئی قوم گو اپنی ہی تاریخ لکھنی چاہے یورپ کی تصنیفات سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔

جس قسم کے مضامین اس رسالے میں وقتاً فوقتاً شائع ہوں گے ان کی تفصیل اس طرح ہے:

[۱]مسلمانوں کی علمی اور عملی ترقیاں۔

[۲] اسلامی تاریخانہ مسائل کی تحقیقات اور یورپ کے مصنفین نے جہاں ان کے متعلق غلطی کی ہے ان کی اصلاح۔

[۳]مشہور مصنفین اسلام کی سوانح عمریاں۔

[۴] عربی فارسی اور اردو زبان کی انشاپردازی اور علم اللسان کی تحقیقات۔

[۵] مصر و روم و ہندوستان کی موجودہ تعلیم و تربیت و تصانیف۔

[٦] یورپ اور مصر و بیروت کے میگزینوں میں جو آرٹکل کسی حیثیت سے اسلام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں ان کے ترجمے۔

کسی حال میں اس رسالے کو پالیٹکس اور مذہبی بحثوں سے سروکار نہ ہوگا۔ یہ رسالہ ۳۲ صفحوں میں ہوگا اور خط خوبصورت اور ۲۰x۲٦ کے آٹھویں حصے پر بہت صاف چھپوایا جائے گا۔ قیمت سالانہ مع محصول ڈاک دو روپیہ آٹھ آنہ ہے۔ چھپائی وغیرہ کے اخراجات ادا کرنے کے بعد جو توفیر ہوگی وہ اسی رسالے کی وسعت اور ترقی دینے یعنی ان میگزینوں اور کتابوں کے بہم پہونچانے میں صرف ہوگی جو رسالے کی زیادہ ترقی کا سبب ہوں۔ قیمت چونکہ پیشگی لی جائے گی اس لئے قیمت کے وصول کا آسان طریقہ ہے کہ جن لوگوں کے نام پرچہ روانہ کیا جائے تین یا چھ مہینے کی قیمت کا حساب لگا کر ویلو پے اے بل روانہ کیا جائے اور جب یہ مدت ختم ہو چکے تو پھر اخیر پرچہ اسی طرح ویلو پے اے بل بھیجا جائے۔

رسالہ کا پہلا پرچہ پہلی مارچ کو شائع ہوگا۔ جو صاحب خریداری کی درخواستیں بھیجیں زرنقد ہرگز نہ بھیجیں بلکہ اس میں ویلو پے اے بل بھیجنے کی اجازت ہو۔

المشتہر شبلی نعمانی

پروفیسر مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ (ممالک مغربی وشمالی)

[سرمور گزٹ، ناہن، مورخہ ۳ رفروری ۱۸۹۳ء صفحہ ۷، ۸]

تعلیقات وحواشی

یہ مراسلہ سرمور گزٹ ناہن (راجستھان) میں بطور اشتہار شائع ہوا ہے۔ علی العموم یہ خیال

کیا جاتا ہے کہ علامہ شبلی دارالعلوم ندوہ سے علاحدہ ہونے اور دارالمصنّفین کے قیام کے بعد ماہنامہ معارف کی اشاعت کا منصوبہ بنایا۔ یہی حیات شبلی میں بھی لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ مراسلہ معارف کے موجودہ خاکہ سے ۲۱ رسال قبل شائع ہوا۔ اس سے یہ واضح ہے کہ المعارف کا خاکہ علامہ شبلی نے علی گڑھ کے زمانہ قیام اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کی ادارت سے پہلے بنایا تھا۔ وہ اس خاکہ کے مطابق رسالہ نہ نکال سکے اور ۲۸ رفروری ۱۸۹۳ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں یہ اعلان کیا کہ المعارف اب شائع نہ ہوگا۔ اس کے بعد ہی علامہ شبلی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اسے بڑی خوبی سے نکالتے رہے۔

سرمور گزٹ ناہن راجستھان سے نکلتا تھا۔ اس کے مدیر مولوی سراج الدین صاحب تھے۔ جنہوں نے سبقت کی غرض سے سیرۃ الفاروق [مطبوعہ: ۱۸۹۵ء] لکھی تھی جس پر سرسید نے اظہار ناراضگی کیا تھا۔ سرمور گزٹ میں علامہ شبلی کی کتابوں الفاروق اور الکلام کے اشتہارات بھی شائع ہوئے ہیں۔ ممکن ہے مضامین بھی شائع ہوئے ہوں، اس لحاظ سے سرمور گزٹ کا ابتک جائزہ نہیں لیا جاسکا ہے۔

(۱) مسٹر آرنلڈ (Mr. T.W.Arnold : 1864 -1930) لندن میں پیدا ہوئے۔ کیمبرج سے بی. اے. کیا۔ وہ کئی زبانوں جرمن، سنسکرت، عربی، فارسی اور اردو سے بخوبی واقف تھے۔ ۱۸۸۷ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں فلسفہ کے استاذ مقرر ہوئے۔ اسی زمانہ میں علامہ شبلی سے عربی سیکھی۔ آرنلڈ نے تقریباً دو درجن کتابیں لکھیں۔ پریچنگ آف اسلام ان کی مشہور کتاب ہے جو ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی اور جس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔

علی گڑھ کے بعد وہ اورینٹل کالج لاہور سے وابستہ ہوئے۔ یہاں انہوں نے عربی میں ایک کتاب "**سواء السبیل الی معرفة المغرب والدخیل**" لکھی۔ علامہ اقبال نے یہیں ان سے تحصیل علم کیا۔ اس کے بعد وہ انڈیا آفس لندن کے اسسٹنٹ لائبریرین ہوکر انگلینڈ واپس چلے گئے۔ علامہ شبلی ان کے بڑے مداحوں میں تھے۔ ان کے روم ومصر وشام کے سفر میں مسٹر آرنلڈ پورٹ سعید تک ساتھ رہے۔ وہ جب ہندوستان سے واپس جارہے تھے، تو علامہ شبلی نے انہیں وداع کرنے کے لئے

حیدرآباد سے بمبئی کا سفر کیا۔ان کی شان میں چند اشعار بھی کہے ہیں[تفصیل کے لئے دیکھیں یادرفتگاں ازمولانا سید سلیمان ندوی،مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۹۳ء ص ۱۰۳/رسالہ فکرونظر،ناموران علی گڑھ، ص ۲۴۳-۲۵۶]

(۲) The Preaching of Islam

(۳) میر ولایت حسین صاحب:علی گڑھ کالج کے اسکول میں استاذ اور علامہ شبلی کے خاص احباب میں تھے۔

[۷]

اشاعت کتب قدیمہ

یہ امر مسلم ہے کہ مسلمانوں نے کسی زمانہ میں تمام علوم وفنون کو نہایت ترقی دی تھی اور ہر فن میں اپنے خاص اجتہاد اور تحقیقات کے نتائج قلم بند کیے تھے، لیکن رفتہ رفتہ علمی مذاق کو اس قدر تنزل ہوتا گیا کہ آج جو تالیفات وتصنیفات عام طور سے رائج ہیں اکثر وہ ہیں جن میں ایجاد اور جدت کی جھلک تک نہیں پائی جاتی۔

قدما کی تصنیفات جن میں ہر جگہ اجتہاد اور ذاتی تحقیقات سے کام لیا گیا ہے، عموماً متروک ہیں۔ خال خال کوئی قلمی نسخہ کسی بڑے کتب خانہ میں پایا بھی جاتا ہے تو ہر شخص کو وہاں تک دسترس نہیں اور اس وجہ سے گویا ان کا وجود وعدم دونوں برابر ہے۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ مثلاً فقہ حنفی کا تمام تر دارومدار امام محمد کی روایات و تصنیفات پر ہے، جن کو اصطلاح فقہ میں ظاہر الروایہ کہتے ہیں، لیکن آج ان میں سے بجز جامع صغیر کے جو نہایت مختصر اور سب سے چھوٹی ہے، ایک کتاب بھی موجود نہیں۔ یہاں تک کہ قسطنطنیہ اور مصر کے عظیم الشان کتب خانے بھی ان سے خالی ہیں۔ اسی طرح فلسفہ اور منطق میں مسلمانوں کو جن ناموروں پر ناز ہوسکتا ہے، وہ یعقوب کندی (۱)، فارابی (۲)، ابن رشد ہیں لیکن ان کے تصنیفات اس قدر نایاب ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ قرآن مجید کے اعجاز وفصاحت و بلاغت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے تمام ہندوستان میں ایک کتاب بھی موجود نہیں۔ تاریخ کی قدیم اور نادر تصنیفات تو گویا ہمارے ملک میں سرے

سے آئی ہی نہیں۔ بعض قدیم کتابیں جو یورپ میں چھپی ہیں، لیکن قطع نظران کے گراں قیمت ہونے کے ہر شخص کو بہم نہیں پہنچ سکتیں۔ ان واقعات کی بنا پر مجھ کو یہ خیال آیا کہ ایک مجلس قایم کی جائے، جو اس مفید اور اہم کام کو انجام دے۔ اگر چہ حیدرآباد کی مجلس دائرۃ المعارف کا بھی یہی موضوع ہے۔ لیکن جو تجربہ اس کے ابتدائے قیام سے اس وقت تک ہوا ہے، اس کے لحاظ سے یہ کہنا ناموزوں نہیں کہ وہ اس درد کی پوری دوا نہیں۔

ملک میں عربی زبان کی جو کساد بازاری ہے اس کے لحاظ سے اگر چہ یہ تجویز فی الجملہ بے محل معلوم ہوتی ہے لیکن ۵/کرور مسلمانوں میں سے دو چار سو ایسے شایق ضرور نکل آئیں گے جو معمولی قیمت پر کتاب کو خرید لیں اور اگر اتنا بھی ہوا تو ہم اس کام کے شروع کرنے پر آمادہ ہیں۔

بالفعل یہ تجویز ہے کہ اس مجلس میں تین قسم کے ممبر قرار دئے جائیں۔

۱- وہ لوگ جو ۱۰/روپے سالانہ چندہ دینا منظور فرمائیں اور یہی لوگ اراکین مجلس قرار دئے جائیں گے اور ان کو امور انتظامی مجلس میں رائے دینے کا حق حاصل ہوگا اور نیز جو کتاب یا کتابیں چھاپی جائیں گی گو کہ ان کی قیمت ان کے چندہ ممبری سے زائد ہو ان کو دی جائیں گی۔

۲- وہ اہل علم جو اس کام میں اپنی رائے اور اپنی واقفیت وتلاش سے امداد دیں اور اس قسم کی کتابوں کو بہم پہنچائیں، ان کو یہ حق حاصل ہوگا کہ مجلس ان کو تمام تجویزات اور حالات سے وقتاً فوقتاً مطلع کرتی رہے گی اور ایک یا دو نسخہ کتاب مطبوعہ کا ان کو نذر کرے گی۔

۳- وہ لوگ جو یہ منظور کریں کہ کتاب چھپنے پر ایک نسخہ قیمت معینہ پر خرید لیں گے۔ ان بزرگوں کا نام رجسٹر میں درج کر لیا جائے گا اور جو کتاب چھپے گی اس کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں ویلیو پے ایبل بھیج دیا جائے گا۔

یہ بتا دینا بھی ضرور ہے کہ سر دست جن کتابوں کا شایع کرنا پیش نظر ہے وہ پانچ

روپیہ قیمت سے زیادہ کی نہیں۔اس غرض کے لیے جو کتابیں اس وقت تک ہم بہم پہنچا چکے ہیں یا جو نہایت جلد بہم پہنچ سکتی ہیں،حسب ذیل ہیں۔

اعجاز القرآن للامام باقلانی،طبقات الشعراء لابن قتیبہ، مناقب الشافعی للامام الرازی، مجموعہ رسائل فارابی، جس میں ۱۵/رسالے شامل ہیں، تلخیص المثال لابن رشد مطبوعہ یورپ،عمدہ لابن رشیق القیر وانی،تاریخ صغیر امام بخاری۔

ہم کو ملک کے تمام بزرگوں سے امید ہے کہ وہ اس تجویز کے بابت ہم سے خط و کتابت فرمائیں گے اور ہم کو مطلع فرمائیں گے کہ ان کو تین قسم کے ممبروں میں سے کس قسم کا ممبر ہونا منظور ہے اور یہ کہ ان کے نزدیک کتب مذکورہ بالا میں سے اول کس کتاب کا شایع کرنا زیادہ مناسب ہے۔

نیز ہم کو ملک کے نامور اخبارات خصوصاً آزاد، وکیل امرتسر،الوقت، پیسہ اخبار، دارالسلطنت سے امید ہے کہ اس تجویز کو اپنے اخبار میں چھاپ کر ہم کو ممنون فرمائیں گے۔

(آزاد،لکھنؤ،۳/اپریل ۱۸۹۶ء)

تعلیقات و حواشی

(۱) یعقوب کندی[۱۸۵-۲۵۶ھ] اپنے عہد میں طب،فلسفہ،حساب، ہندسہ،منطق اور علم نجوم کا زبردست عالم تھا۔اس کا شمار نامور حکمائے اسلام میں ہوتا ہے۔کوفہ میں پیدا ہوا، بغداد میں تحصیل علم کیا۔ مامون کے دربار سے وابستہ رہا۔ بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا اور فلسفہ کی مشکل کتابوں کی توضیح، تلخیص اور تفصیل کی لیکن اس کی تصانیف ناپیدا ہیں۔(تفصیل کے لئے دیکھیں حکمائے اسلام، ج ا،ص ۷۶-۸۵،از مولانا عبدالسلام ندوی)

(۲) ابونصر محمد بن محمد فارابی[۲۵۹-۳۳۹ھ]مشہور فلسفی اور متعدد زبانوں کا ماہر تھا۔ترکستان کے شہر فاراب میں پیدا ہوا۔بغداد میں علوم عقلیہ کی تعلیم حاصل کی، پھر شام چلا گیا اور سیف الدولہ کے دربار

سے وابستہ ہوگیا۔اس نے ارسطو کی کتابوں کے مطالعہ پر بڑا زورصرف کیا اور فلسفہ میں بڑی مہارت پیدا کی اور طب وفلسفہ پر متعدد کتابیں سپرد قلم کیں۔۸۰ر سال کی عمر میں ۳۳۹ھ میں دمشق میں وفات پائی۔
(تفصیل دیکھیں حکمائے اسلام، ج۱،ص ۱۰۱-۱۴۸، ازمولانا عبدالسلام ندوی)

[۸]

وقف اولاد کے مسئلہ کے متعلق
ایک نہایت ضروری تحریک

جناب من!

یہ ایک بدیہی اور مسلم الثبوت واقعہ ہے کہ انگریزی گورنمنٹ نے عموماً یہ اصول ملحوظ رکھا ہے اور ابتدائے حکومت سے آج تک اس پر نہایت مضبوطی سے قایم ہے کہ کسی مذہب کے مذہبی احکام اور مسائل سے بلا کسی سخت مجبوری حالت کے تعرض نہ کیا جائے اور یہ وہ خصوصیت ہے کہ انگریزی گورنمنٹ کے سوا تمام دنیا میں اس کی بہت کم مثال مل سکتی ہے۔ بااین ہمہ وقف اولاد کے مسئلہ میں قیصر ہند نے بہ مشورہ پریوی کونسل جو فیصلہ صادر کیا ہے، وہ فقہ اسلام کے خلاف ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ بعض عدالتوں نے غلطی سے یہ سمجھا کہ اسلامی فقہ سے اولاد کے حق میں وقف کرنا ثابت نہیں ہوتا اور عامی آدمی گمان یہی کرسکتا ہے کہ وقف خیرات کا نام ہے اور اولاد پر خیرات کرنے کے کیا معنی ہوسکتے ہیں۔ جسٹس مسٹر امیر علی صاحب، سابق جج ہائی کورٹ کلکتہ(۱)، نے اپنے شریک ججوں سے مشورہ کر کے اس مسئلہ کو طے کیا تھا، لیکن اپنے فیصلہ میں فقہ کی کتابوں کے حوالے نہیں دئے تھے، اس لیے پریوی کونسل نے اس کے ساتھ اعتنا نہیں کیا اور وقف اولاد کو ناجائز قرار دیا۔

لیکن چوں کہ یہ مسئلہ فقہ اسلامی کا ایک مسلم مسئلہ ہے اور پریوی کونسل نے جو

فیصلہ کیا ہے وہ صرف غلط فہمی کی بنا پر ہے، اس لیے یہ یقین ہے کہ اگر گورنمنٹ انگریزی اور پریوی کونسل کو یقین دلایا جائے کہ یہ ایک مذہبی مسئلہ ہے اور اس میں مداخلت کرنا مذہبی احکام میں مداخلت کرنا ہے تو یہ قطعی ہے کہ پریوی کونسل اپنے فیصلہ کو مسترد کرلے گی۔ اس بنا پر تمام مسلمانوں کو اس امر کے متعلق ایک متفقہ کوشش کرنی چاہیے، جس کا طریقہ حسب ذیل ہے۔

۱-ایک رسالہ اردو زبان میں نہایت تفصیل اور تحقیق کے ساتھ فقہ کی مستند کتابوں سے تیار کیا جائے جس میں ثابت کیا جائے کہ وقف اولاد فقہ اسلامی کا ایک مسلم اور قطعی مسئلہ ہے۔

۲-اس رسالہ پر تمام علمائے ہندوستان سے دستخط کرائے جائیں۔

۳-اس رسالہ کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرایا جائے۔

۴-ہندوستان کے ہائی کورٹوں اور پریوی کونسل نے جس بنا پر وقف اولاد کو ناجائز قرار دیا ہے، ان دلائل سے تعرض کیا جائے اور ان کی غلطی دکھائی جائے۔

۵-ایک محضر اس مضمون کا تیار کیا جائے کہ چوں کہ وقف اولاد کا مسئلہ مسلمانوں کا ایک مذہبی مسئلہ ہے، اس لیے پریوی کونسل نے اس کے متعلق جو غلط فہمی پیدا کی ہے، اس کی اصلاح قانون کے ذریعہ سے کردی جائے۔

۶-اس محضر پر تمام اسلامی انجمنوں اور عام مسلمانوں کے دستخط کرا کے گورنمنٹ کے پاس بھیجا جائے۔

ان تمام امور کے انجام دینے کے لیے ایک رقم کی ضرورت ہے، جس کی تعداد تخمیناً دو تین ہزار ہوگی، جس سے رسالہ کی تیاری، انگریزی ترجمہ اور خط و کتابت کے مصارف ادا ہوسکیں۔ اس بنا پر ہم تمام مسلمانان ہندوستان سے التجا کرتے ہیں کہ اگر وہ اس تدبیر کو ضروری سمجھتے ہیں تو خاکسار کو مطلع فرمائیں اور یہ بھی ظاہر کریں کہ وہ وجوہ مفصلہ ذیل میں سے کس قسم کی شرکت کرسکتے ہیں۔

۱-مشورہ اور رائے میں شرکت۔

۲-چندہ میں شرکت۔

۳-رسالہ کی ترتیب اور طیاری اور قانونی مشورہ اور انگریزی ترجمہ کرنے میں شرکت۔

(۲۴ر دسمبر ۱۹۰۸ء، مطبوعہ: الندوہ، ج ۴، نمبر ۱۲، ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۰۹ء)

تعلیقات و حواشی

انگریز جج وقف علی الاولاد کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور عدالتوں میں وقف علی الاولاد کے مقدمات میں اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے متعدد وقف املاک برباد ہوئیں۔ علامہ شبلی اسے مسلمانوں کا بہت بڑا اضیاع خیال کرتے تھے۔ چنانچہ مذکورہ مراسلہ لکھ کر انہوں نے اس کے خلاف تحریک شروع کی جس میں انہوں نے فوری طور پر ایک رسالہ ''وقف علی الاولاد'' لکھا جس میں شریعت کے مطابق وقف علی الاولاد کے مسئلہ کو ثابت کیا۔ پھر تمام ہندوستان کے ائمہ و مفتیان کرام کو خطوط لکھے اور ان کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں ملک میں ہر طرف یہ تحریک اور اس کے اغراض و مقاصد بھی پہنچ گئے اور اس تحریک کی اہمیت کا عام احساس ہوا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے جب اپنے موقف کی تائید میں اہل علم کے دستخط چاہے تو بے شمار لوگوں نے تائید کی اور دستخط کئے۔ اسی کی روشنی میں مسٹر محمد علی جناح نے پارلیامنٹ میں اس مسئلہ کو اٹھایا جسے بالآخر حکومت نے قانونی شکل دی۔ اس طرح علامہ شبلی کو اس بڑے مسئلے میں بڑی کامیابی ملی۔

(۱) سید امیر علی [۱۸۴۹-۱۹۲۸ء] بڑے بیدار مغز مسلمان اور ہائی کورٹ کے جج تھے۔ ایک زمانہ میں یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کی شناخت بن گئے تھے۔ انگریزی میں کئی کتابیں لکھیں جس میں اسپرٹ آف اسلام بے حد مقبول ہوئی۔ ان کے بعض خیالات سے اہل علم کو اختلاف بھی رہا تاہم ان کے علم و فضل کے سب معترف رہے۔ (یادرفتگاں از مولانا سید سلیمان ندوی)

[۹]

اجلاس ندوہ

جناب من!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کو معلوم ہوگا کہ ارکان انتظامیہ ندوہ کی میعاد ممبری ختم ہوگئی ہے اور ۴۸ر ارکان کے انتخاب کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے ابتک لوگوں کے نام انتخاب کر کے دفتر میں نہیں بھیجے ہیں، اس لئے امور ذیل گذارش ہیں:

۱۔ آپ ۴۸ر شخصوں کے نام پیش کر سکتے ہیں۔

۲۔ فہرست ارکان سابق مرسلہ مولوی عبدالحی صاحب (۱) آپ کے پاس موجود ہوگی اس کو پیش نظر رکھ کر جو بزرگ قابل انتخاب ہوں، ان کے نام انتخاب کیجئے۔ یہ انتخاب یا ان بزرگوں کی قابلیت علمی یا وجاہت دنیوی کے لحاظ سے ہو یا اس لحاظ سے ہو کہ ان لوگوں نے زمانہ ممبری میں عمدہ کارگذاری اور ہمدردی کا اظہار کیا۔

۳۔ جدید ارکان انتخاب کیجئے یعنی ہر صوبہ کے مشاہیر اور ذی اثر اشخاص کو لیجئے، مثلاً مدراس میں مولانا عبدالسبحان (۲)، نواب غلام احمد خاں (۳)، بمبئی میں قاضی کبیر الدین (۴)، مولوی رفیع الدین بیرسٹر (۵)، حاجی یوسف ثعبانی (۶)، کلکتہ میں مولوی شمس الہدیٰ (۷)، مولوی یوسف (۸)، پنجاب میں مسٹر محمد شفیع (۹)، شیخ غلام صادق (۱۰)، بابو نظام الدین (۱۱)، ممالک متحدہ میں بہت سے لوگ ہیں جن کو آپ خود بھی جانتے ہیں۔

۴۔آپ خود اپنا نام بھی پیش کر سکتے ہیں۔

۵۔مدت نامزدگی بہت کم رہ گئی ہے اس لئے فوراً دفتر میں منتخب اشخاص کے نام بھیج دیجئے۔

۶۔دستورالعمل کی رو سے انتخاب ارکان کا جو جلسہ ہوگا اس میں صرف زبانی ووٹ [رائے] لی جائے گی۔تحریری ووٹ کافی نہیں،اس لئے جب جلسہ کی تاریخ کی اطلاع دی جائے تو جلسہ میں آپ کو خود تکلیف فرمانا چاہیئے یا بہ صورت مجبوری وہاں کے کسی معزز صاحب کو بھیجنا چاہیئے۔

۷۔انتخاب ارکان کے لئے ووٹ دینا ارکان انتظامی پر محدود نہیں بلکہ ہر ممتاز شخص ووٹ دے سکتا ہے۔صرف یہ شرط ہے کہ [۲/روپئے] بھیج کر ندوہ کا عام ممبر بن جائے اور موقع انتخاب پر موجود ہو۔

عمائدین حضرات ذیل قابل انتخاب ہیں۔

مولوی لطف اللہ (۱۲)،مفتی عدالت العالیہ حیدرآباد دکن،مولانا عبدالجبار غزنوی (۱۳)،مولوی عبداللہ صاحب غازی پوری (۱۴)،مولوی ثناء اللہ امرتسری (۱۵)،ابوبکر شہاب عرب حیدرآباد،مولوی حمیدالدین پروفیسر عربی،یونیورسٹی الہ آباد (۱۶)۔

شبلی نعمانی

۱۰/جنوری ۱۹۱۱ء

[ماخذ: مکتوبات شبلی ص ۱۰۸-۱۰۹]

تعلیقات وحواشی

علامہ شبلی نے یہ مراسلہ ندوہ کے ۱۹۱۱ء کے اجلاس کے لئے اس کے ارکان کے نام لکھا تھا۔یہ مراسلہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۸۸۶-۱۹۵۰ء] اور مولوی قیام الدین بخت جون پوری

[۱۸۶۵-۱۹۴۸ء] کے نام درج ہے۔

اس مراسلہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی ندوہ کے ارکان کے انتخاب میں بھی پوری دلچسپی لیتے تھے۔اوراس کے لئے فراخ دلی کے ساتھ اہل علم اورارباب کمال کی نشاندہی کرتے تھے۔اس میں ان کا نقطہ نظر مسلک سے بالاتر ہوتا تھا۔غالبًا ندوہ کے مفاد میں یہ طرز عمل اختیار کیا۔

(۱) مولانا سید عبدالحی حسنی [م: ۲رفروری ۱۹۲۳ء] سابق ناظم ندوۃ العلماء، پایہ کے عالم و مصنف اورمورخ تھے۔انہوں نے متعدد کتابیں الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، نزہۃ الخواطر، یادایام اورگل رعنا وغیرہ لکھیں۔ان کی مفصل سوانح عمری مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ''حیات عبدالحی'' کے نام سے لکھی ہے جسے اردومراٹھی پبلی کیشنز،پونہ نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۲) مولانا عبدالسبحان مدراسی [م:ارفروری ۱۹۲۰ء] آنریری پریسیڈنسی مجسٹریٹ مدراس، ندوہ کے نہایت سرگرم رکن اور انجمن معین الندوہ مدراس کے سکریٹری تھے۔دینی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔بڑے فعال اورنیک طینت شخص تھے۔مدراس مجلس اشاعت الاسلام کی بنیاد رکھی۔

(مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلماء، ج ۲، ص ۱۸۴، ۱۹۱، ۲۰۷، ۲۶۴، ۲۶۷)

(۳) نواب غلام احمد خاں، مدراس [م: ۲۵ر دسمبر ۱۹۴۸ء] ندوہ کے ایک ہمدرد و بہی خواہ تھے۔وہ کولار میسور کے رہنے والے تھے، وہ میسور کے اہم سیاسی رہنما اور قومی خدمت گذار تھے۔میسور اسمبلی میں مسلمانوں کے برسوں لیڈر رہے۔مولانا ابوالکلام آزاد کے نام علامہ شبلی کے مکاتیب میں ان کے ذکر آیا ہے۔(یادرفتگاں از مولانا سید سلیمان ندوی، ص ۳۷۸)

(۴) قاضی کبیرالدین [م: جولائی ۱۹۴۰] بمبئی کے ممتاز بیرسٹر اور قانون داں تھے۔مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔انجمن اسلام بمبئی کے صدر اورآل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سرگرم اور فعال رکن رہے۔کوکن کے مسلمانوں کی تعلیمی بیداری میں ان کا بھی حصہ ہے۔

(۵) مولوی رفیع الدین بیرسٹر: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۶) حاجی یوسف ثوبانی: یہ بمبئی کے ممتاز تاجر عمر ثوبانی کے صاحبزادے تھے۔انہیں تعلیم وتربیت

سے بڑی دلچسپی رہی۔ اس حیثیت سے وہ بمبئی میں ممتاز تھے۔

(۷) صدر انجمن معین الندوہ

(۸) مولوی محمد یوسف صاحب کلکتہ، جج ہائی کورٹ کلکتہ

(۹) سر محمد شفیع [۱۸۶۹-۱۹۳۲ء] لاہور کے زمیندار خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور کرسچن کالج لاہور سے تحصیل علم کے بعد بیرسٹری کے لئے انگلینڈ گئے۔ ۱۸۹۲ء میں بیرسٹری پاس کی۔ ہوشیار پور اور لاہور میں وکالت کی۔ انڈین مسلم لیگ پنجاب شاخ کے آنریری سکریٹری مقرر ہوئے۔ دس سال تک امپیریل کونسل کے رکن رہے۔ انہیں تعلیم سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اردو کے فروغ میں بھی حصہ لیا۔ علی گڑھ تحریک کے بھی زبردست حامی تھے۔ ۷/جون ۱۹۳۲ء کو وفات پائی۔

(حواشی کلیات مکاتیب اقبال، ج ۱، ص ۱۰۶۰-۱۰۶۱)

(۱۰) خان بہادر شیخ غلام صادق امرت سری [م: اپریل ۱۹۲۱ء] رئیس و آنریری مجسٹریٹ امرت سر، ندوہ کے ممتاز رکن تھے اور امرت سر کے بڑے بااثر شخص تھے۔ (تاریخ ندوۃ العلماء، ج ۲، ص ۲۶۸)

(۱۱) بابو نظام الدین، آنریری مجسٹریٹ امرت سر [م: ۹/مارچ ۱۹۲۲ء] رئیس امرت سر، ندوہ کے رکن تھے۔ (تاریخ ندوۃ العلماء، ج ۲، ص ۲۶۹)

(۱۲) مفتی لطف اللہ: مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن۔

(۱۳) مولوی عبدالجبار غزنوی: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۱۴) مولانا حافظ عبداللہ غازی پور [م: ۲۶/نومبر ۱۹۱۸ء] اصلاً موضع بندی ضلع اعظم گڑھ کے باشندہ تھے۔ غازیپور میں مستقل سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے غازی پوری سے معروف ہیں۔ یہ اہل حدیث عالم تھے۔ ان سے متعدد ارباب کمال نے اکتساب علم کیا۔ درس وتدریس میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ چشمہ رحمت غازی پور اور مدرسہ احمدیہ آرہ میں ان کا چشمہ علم برسوں جاری رہا۔ مولانا فاروق چریا کوٹی ان کے استاذ تھے، اس طرح یہ علامہ شبلی کے استاذ بھائی تھے۔

(تفصیل کے لئے دیکھیں گلستان حدیث از محمد اسحاق بھٹی)

(۱۵) مولوی ثناء اللہ امرت سری [م:۱۵/مارچ ۱۹۴۸ء]مفسرقرآن اورمشہورمناظر تھے۔آریہ سماجیوں،عیسائیوں اورقادیانیوں سے بڑے معرکے کے مناظرے کئے اورانہیں شکست دی۔وہ ایک بڑے اہل قلم بھی تھے۔دسیوں کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔(یادرفتگاں،ص۳٦۹)

(۱٦) صاحب تفسیر نظام القرآن علامہ حمیدالدین فراہی [۱۸٦۳-۱۹۳۰ء] علامہ شبلی کے ماموں زاد بھائی اورشاگرد تھے۔عربی تصنیفات میں اپنا نام المعلم عبدالحمید لکھتے تھے۔تفصیلی حالات کے لئے دیکھیں''ذکرفراہی''۔ڈاکٹرشرف الدین اصلاحی،انجمن طلبہ قدیم،مدرسۃ الاصلاح،سرائے میر۲۰۰۱ء

[۱۰]

آنحضرت ﷺ کی مفصل اور مستند سوانح عمری

کیا عجیب بات ہے! ہندوستان میں چھ کروڑ مسلمان ہیں، مشرقی علوم وفنون ابھی تک زندہ ہیں، نہایت لایق اور قابل فخر انشا پرداز موجود ہیں، ملکی زبان نے ایسی قابل قدر تصنیفات پیش کیں کہ روم ومصر میں مضمون کے لحاظ سے ان کا جواب نہیں۔ قومی روایات کا مذاق بچہ بچہ کی رگ میں ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قدیم اور جدید دونوں گروہ کو یہ عقیدت ونیاز ہے کہ آپ کے نام پر جان ومال قربان کر دینا کوئی بات نہیں۔

یہ سب ہے لیکن اتنی بڑی وسیع قوم اور اتنی عالم گیر زبان (اردو) میں جناب رسول اللہ ﷺ کی کوئی سوانح عمری نہیں، یا ہے تو ایسی ہے کہ اس کو سیرت نبوی کہنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مبارک کو آزردہ کرنا ہے۔ سیرت نبوی کی ضرورت اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ قوم میں جدید تعلیم وسعت سے پھیلتی جاتی ہے اور یہی جدید تعلیم یافتہ گروہ ایک دن قوم کی قسمت کا مالک ہوگا۔ یہ گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی اگر جاننا چاہتا ہے تو اردو میں کوئی مستند کتاب نہیں ملتی۔ اس لیے اس کو چار ناچار انگریزی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جن میں یا تعصب کی رنگ آمیزیاں ہیں یا ناواقفیت کی وجہ سے ہر موقع پر غلطیاں ہیں۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ سیرت نبوی کی ضرورت پہلے صرف تاریخی حیثیت سے تھی، لیکن اب عقائد کی حیثیت سے بھی ہے۔ یورپ جو اسلام پر نکتہ چینی کرتا ہے، زیادہ تر

اس بنا پر کرتا ہے کہ بانی اسلام کے اخلاق و عادات و تاریخ زندگی ایسی نہیں کہ ان کو خدا کا بھیجا ہوا معصوم پیغمبر کہا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ سر ولیم میور صاحب (۱) نے آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی پر جو کتاب لکھی اس کو پادریوں نے اپنا خاص کام سمجھا اور خود صاحب موصوف نے تصریح کی ہے کہ انھوں نے یہ خدمت زیادہ تر پادری فنڈر صاحب کی رفع ضرورت کے لیے انجام دی۔

میں ایک مدت سے ان باتوں کا احساس کر رہا تھا، لیکن اس بنا پر قلم اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ آنحضرت ﷺ کے واقعات میں ایک حرف بھی صحت کے اعلیٰ معیار سے ذرا اتر جائے تو سخت جرم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں سینکڑوں ہزاروں کتابیں لکھیں گئیں لیکن جو گروہ زیادہ محتاط اور ادب شناس تھا اس نے بہت کم جرأت کی۔ کبار محدثین مثلاً امام بخاری (۲)، مسلم (۳)، ترمذی (۴)، ابن داؤد (۵)، ابن ماجہ (۶)، امام مالک (۷) نے سیرت نبوی میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔

لیکن اس احتیاط سے بہت سے عظیم الشان مقاصد فوت ہوئے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مؤرخین اسلام مثلاً طبری (۸)، ابن قتیبہ (۹)، بلاذری (۱۰)، محمد بن اسحاق (۱۱) وغیرہ نے جو علم حدیث میں بھی کمال رکھتے تھے باوجود تدین اور احتیاط کے آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی میں مبسوط کتابیں لکھیں۔ جس ضرورت نے مؤرخین کو اس پر آمادہ کیا، وہی آج بھی ہے بلکہ آج یہ ضرورت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔

قوم کی طرف سے ایک مدت سے تقاضا ہے کہ میں سب کام چھوڑ کر سیرت نبوی کی تالیف میں مصروف ہو جاؤں۔ خود میں بھی اپنی پہلی رائے سے رجوع کر چکا ہوں اور اس شدید ضرورت کو تسلیم کرتا ہوں، لیکن یہ کام انجام دینا آسان کام نہیں۔ میں ان مشکلات کو کسی قدر توضیح سے لکھتا ہوں تا کہ قوم اپنی اور میری ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھ لے۔

عربی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر سوانح عمریاں لکھی گئیں اگرچہ بے شمار ہیں لیکن جو اصل ماخذ ہیں حسب ذیل ہیں:

مغازی موسیٰ بن عقبہ	:	یہ سب سے قدیم تصنیف ہے۔ مصنف نے ۱۴۵ھ میں وفات پائی۔
مغازی بن اسحاق	:	یہ آغاز دولت عباسیہ کی تصنیف ہے۔
سیرت ابن ہشام	:	مصر میں چھپ گئی ہے۔
طبقات ابن سعد	:	اس کی دو جلد خاص سیرت نبوی میں ہے۔
تاریخ ابن واضح کاتب عباسی	:	یورپ میں چھپی ہے، پہلی جلد میں مختصراً سیرت نبوی بھی ہے۔
طبری المتوفی ۳۱۰ھ	:	مشہور کتاب اور ابن الاثیر اور ابن خلدون کا ماخذ یہی کتاب ہے۔

یہی کتابیں تمام تاریخی کتابوں کا ماخذ ہیں، لیکن ان میں سے ایک کتاب بھی ایسی نہیں جس میں صرف صحیح واقعات درج کیے گئے ہوں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ان کی تحقیق وتنقید کی جائے۔ ان کتابوں میں اکثر راویوں کے نام مذکور ہیں، اس لیے اگر ان کے حالات معلوم ہو جائیں تو آسانی سے روایت کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا حال معلوم ہوسکتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اسمائے رجال کی جو مشہور کتابیں ہیں مثلاً تہذیب التہذیب وتہذیب الکمال وتہذیب الاسماء وغیرہ ان میں ان راویوں میں سے اکثر کے حالات نہیں ملتے۔ اس بنا پر سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کرنا اور راویوں کا پتہ لگانا پڑے گا۔ اسی کے ساتھ تاریخی سلسلہ سے الگ بہت سی حدیث اور آثار کی نایاب اور مستند کتابوں کو مہیا کرنا پڑے گا جن سے سیرت نبوی کے متعلق صحیح واقعات معلوم ہوں۔

حدیث کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے واقعات مختلف

واقعات کے ضمن میں آجاتے ہیں، اس غرض سے حدیث کی تمام کتابیں چھاننی پڑیں گی کہ ریزہ چینیوں سے ذخیرہ مہیا کیا جائے۔

یہ ایک طرف کی مشکلات ہیں، دوسری طرف یہ دقت ہے کہ آج کل جو شخص سیرت نبوی کو مرتب کرنا چاہے اس کا بڑا فرض یہ ہے کہ یورپ نے آنحضرت ﷺ کے حالات میں جو بے شمار کتابیں لکھی ہیں ان پر نظر رکھتا ہو۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یورپ کا ماخذ صرف عربی ہی تصنیفات ہو سکتی ہیں لیکن یورپین مصنفین عموماً ان ہی واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ نتیجہ ان کے موافق نکلتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ بھی بہت سے ایسے راویوں سے استناد کرتے ہیں جو مسلمانوں میں عام طور پر مشہور و معروف ہیں لیکن دراصل ان کا کچھ اعتبار نہیں، مثلاً میور صاحب نے اپنی کتاب کا مدار زیادہ تر واقدی اور ابن ہشام پر رکھا ہے، حالاں کہ یہ دونوں محدثین کے نزدیک چنداں قابل اعتبار نہیں۔

غرض یہ نہایت ضروری ہے کہ کم از کم انگریزی زبان میں جو کتابیں سیرت نبوی کے متعلق لکھی گئی ہیں، ان سے واقفیت حاصل کی جائے۔

واقعات مذکورہ بالا سے ثابت ہوگا کہ ایک مکمل سیرت کی تصنیف کے لیے امور ذیل کی ضرورت ہے۔

۱- ایک وسیع کتب خانہ جس میں وہ تمام عربی اور انگریزی کتابیں ہوں جن کا اشارہ اوپر ہو چکا۔

۲- علما کی ایک جماعت جن سے مشورہ اور مدد مل سکے، ندوہ میں قابل ارباب علم موجود ہیں۔

۳- ایک اسٹاف جس میں حسب ذیل اشخاص ہوں۔

معاون-۲، جو روایتوں کے نقل و انتخاب میں مدد دیں۔

کاتب-۲، مسودہ کے صاف کرنے کے لیے۔

مترجم انگریزی-۲، جو انگریزی کتابوں کا ترجمہ کریں۔

چپراسی-۱

ان مصارف میں سے کتابوں کے خریدنے کے لیے یک مشت رقم درکار ہے، باقی ماہوار مصارف ہیں، جس کی تعداد دوسو پچاس روپیہ ماہوار سے کسی طرح کم نہیں ہوسکتی اور چوں کہ محض اردو ایڈیشن بے کار ہے، جب تک انگریزی اور عربی میں شایع نہ ہو۔ سیرت نبوی کی اشاعت کی ضرورت سب سے زیادہ یورپ میں ہے کہ یورپ کے خیالات کی اصلاح ہو۔ اس لیے کتاب کی تصنیف کے ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا جائے۔ اس بنا پر مصارف کی تعداد میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا۔

ان اسباب کی بنا پر ایک مجلس قایم کی جاتی ہے جس کا نام مجلس تالیف سیرت نبوی ہوگا۔

اس کے ارکان حسب ذیل ہوں گے۔

مربی، جو حضرات کم از کم یک مشت ہزار روپیہ یا دس دس روپیہ ماہوار عنایت فرمائیں۔

ارکان، جو حضرات ایک روپیہ ماہوار عنایت فرمائیں۔

معین، جو حضرات نایاب قلمی تصنیفات ملکیۃً یا مستعار عنایت فرمائیں یا کسی اور مفید طریقہ سے مدد دیں۔

ماہانہ چندہ ویلو رسید کے ذریعہ سے وصول کیا جائے گا۔

جو حضرات اس تجویز کے متعلق خط کتابت کرنا چاہیں وہ مجھ کو لکھنؤ کے پتہ سے مخاطب فرمائیں۔ (الندوہ جلد ۹ نمبر ا جنوری ۱۹۱۲ء مطابق محرم ۱۳۳۰ھ)

تعلیقات و حواشی

علامہ شبلی کے دل میں گوناگوں وجوہ سے جس کا ذکر اوپر مراسلہ میں آیا ہے جب سیرت نبوی

کا خیال آیا تو یہ مراسلہ ماہنامہ الندوہ میں لکھا۔اس مراسلہ کا اثر یہ ہوا کہ ہر طرف سے سیرت نبوی کی تالیف کے لئے آوازیں بلند ہوئیں۔سب سے پہلے ایک خاتون نے چندہ بھیجا۔ پھر بھوپال سے نواب حمیداللہ خاں نے کتابوں کی خریداری کے لئے یکمشت ہزار روپئے بھیجے۔غرض اس مراسلہ نے ہر باشعور شخص کو سیرت نبوی کی طرف متوجہ کر دیا اور علامہ شبلی نے بڑے پیمانہ پر سیرت نبوی کے کام کا آغاز کیا جس کے نتیجہ میں سیرت نبوی کی دو جلدیں شبلی نے لکھیں اور اسی پر ان کی زندگی کا خاتمہ ہوا اور ان کا یہ قطع سچ ثابت ہوا کہ

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

یہ بڑا اہم مراسلہ ہے اس نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کیا۔اس سے پہلے علی العموم سیرت پر بحث ومباحثہ نہیں ہوتا تھا۔اگر چہ سیرت پر بعض مختصر کتابیں تھے اور سیرت کے واقعات رسائل میں چھپتے تھے تاہم سیرت نبوی کی طرف بھرپور توجہ نہیں دی جاتی تھی۔

علامہ شبلی کے اس مراسلے کا علی العموم استقبال ہوا مگر ایک آواز اس کے خلاف بھی بلند ہوئی۔ مولوی انشاءاللہ خاں ایڈیٹر الوطن لاہور نے لکھا کہ چونکہ سیرت نبوی کے لئے مولانا محمد سلیمان منصور پوری قلم اٹھا چکے ہیں اس لئے علامہ شبلی کو زحمت کی ضرورت نہیں۔سیرت نبوی کے متعلق اس نامناسب آواز کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔

اس مراسلہ کے ایک عرصہ بعد جب سیرت نبوی کا کام شروع ہوا اور علامہ شبلی نے اس کا مفصل مقدمہ لکھا تو انہوں نے اسے بھی شائع کرایا تا کہ اہل علم دیکھ لیں کہ کتاب کس معیار پر لکھی جارہی ہے۔اس سلسلہ میں کسی قسم کا کوئی مسئلہ ہو تو اسے حل کیا جاسکے۔یہ مقدمہ الہلال میں شائع ہوا تو اس سے متعلق دو مراسلے شائع ہوئے۔پہلا مراسلہ حکیم غلام غوث بہاول پوری کے قلم سے تھا۔(دیکھیں الہلال

۳۰/اپریل ۱۹۱۳ء ص ۲۸۲)

دوسرا مراسلہ دو قسطوں میں مولوی محمد اسحاق مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ نے لکھا۔ (دیکھیں الہلال ۲۱/مئی ۱۹۱۳ء و ۲۸/مئی ۱۹۱۳ء) اس سلسلہ میں کسی اور مراسلہ کا ذکر نہیں ملتا، البتہ مولانا عبدالشکور لکھنوی، ایڈیٹر النجم، نے اپنے طور پر ایک تحریر لکھ کر بیگم بھوپال تک پہونچائی کہ سیرت کی امداد رک جائے۔ غرض مخالفین کی طرف سے ہر ممکن کوشش کی گئی کہ سیرت شبلی کے قلم سے نہ شائع ہو سکے مگر ایسا نہیں ہوا۔ سیرت بڑی شان سے نکلی اور آج وہ نہ صرف اردو زبان بلکہ بعض دیگر زبانوں میں بھی مثالی تصنیف تصور کی جاتی ہے۔

(۱) سر ولیم میور: [۱۸۱۹-۱۹۰۵ء] مشہور مستشرق جس نے سیرت نبویؐ اور تاریخ اسلام کو اپنا موضوع تحقیق بنایا اور جی بھر کے زہر افشانی کی۔ سر سید احمد خاں نے اسی کے جواب میں خطبات احمدیہ لکھی ہے۔

یہ گلاسگو میں پیدا ہوا۔ گریجویشن کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کی۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں مختلف عہدوں پر مامور رہا۔ میور کالج (الہ آباد یونیورسٹی) کا قیام اس کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں اسلام اور مسلمانوں کی تصویر کشی میں اپنا سارا زور قلم صرف کیا۔ ۱۱/جولائی ۱۹۰۵ء میں ایڈمبرا میں انتقال ہوا۔

(۲) ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل معروف بہ امام بخاری [۸۱۰-۸۷۰ء] کے برابر درجہ کا محدث آج تک پیدا نہیں ہوا۔ وہ بخارا کے رہنے والے فارسی الاصل تھے۔ گیارہ برس کی عمر میں حدیث سے شغف پیدا ہوا۔ تحصیل حدیث کے لئے عالم اسلام کے ممتاز مقامات، بلخ، مرو، نیشاپور، بصرہ، کوفہ، بغداد، مکہ، مدینہ، دمشق، عسقلان، حمس، قاہرہ وغیرہ کا سفر کیا اور وہاں کے محدثین سے اکتساب فیض کیا۔ ان کی مؤلفات کی تعداد ۲۵/ بتائی جاتی ہے۔ ان میں بعض شائع بھی ہوئیں لیکن ان کا طرہ امتیاز الجامع الصحیح [بخاری] ہے، جو کتاب اللہ کے بعد سب سے زیادہ صحیح تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ عدیم النظیر کتاب ۱۶/سال میں مرتب ہوئی۔ امام بخاری نے چھ لاکھ احادیث میں سے چھ ہزار دوسو [۶۲۰۰] احادیث کا انتخاب کیا۔

صحیح بخاری ۱۸٦۸ء میں ہالینڈ اور ۱۸۷۹ء میں مصر سے شائع ہوئی۔ یہ دنیا کی سب سے معتبر اور مقبول ترین کتاب ہے۔اس سے زیادہ محنت وتحقیق اور صحت کے التزام کے ساتھ آج تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔اس کی متعدد شروح اور مختصرات بھی لکھے گئے اور متعدد زبانوں میں ترجمے ہوئے۔[امام بخاری اور صحیح بخاری کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، سیرۃ البخاری از مولانا عبدالسلام مبارک پوری، مطبوعہ: الہ آباد۔ ۱۳٦۷ھ]

علامہ شبلی کو صحیح بخاری سے خاص شغف تھا۔ندوہ کے زمانہ معتمدی میں درس بخاری کا اہتمام کرتے تھے۔سیرۃ النبیؐ کی تصنیف میں قرآن مجید کے بعد صحیح بخاری ہی پر انہوں نے سب سے زیادہ اعتماد کیا ہے۔

(۳) ابوالحسنین مسلم بن حجاج نیشاپوری معروف بہ امام مسلم [۲۰۴-۲٦۱ھ] شیخ المحد ثین تھے۔ تحصیل حدیث کے لئے عرب، مصر، شام اور عراق وغیرہ کا سفر کیا اور مشہور محد ثین سے حدیث سماعت کی، انہوں نے کئی کتابیں لکھیں مگر ان کا عظیم الشان کارنامہ صحیح مسلم کی تدوین ہے جو بخاری کے بعد حدیث کی سب سے مستند کتاب خیال کی جاتی ہے۔اس کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے۔صحیح مسلم کے اردو اور انگریزی میں ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔

(۴) امام ترمذی [۲۰۹-۲۷۹ھ] مشہور محدث، جن کی جامع ترمذی کو عالم گیر شہرت حاصل ہے۔ انہوں نے طلب علم کے لئے کوفہ، بصرہ، رے، خراسان اور حجاز وغیرہ کا سفر کیا۔امام بخاری کے شاگرد ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان کے مدارس عربیہ میں بھی داخل درس ہے اور تمام عالم میں پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔

(۵) امام داؤد (سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد بن عمر بن عمران الازدی) [۲۰۲-۲۷۵ھ] علم حدیث کے زبردست امام، سماعت حدیث کے لئے بصرہ، بغداد، مصر، شام، حجاز، عراق، خراسان اور جزیزہ وغیرہ شہروں کا سفر کیا اور علم حدیث میں بڑی مہارت حاصل کی۔ان کے درس میں بے شمار افراد شریک ہوتے تھے۔متعدد کتابیں لکھیں لیکن جو مقام و مرتبہ سنن ابی داؤد کو حاصل ہوا وہ کسی اور

کے نصیب میں نہیں آیا یہ بھی صحاح ستہ میں شامل ہے۔

(۶) محمد بن یزید بن عبداللہ ابن ماجہ الربعی معروف بہ امام ابن ماجہ [۲۰۹-۲۷۳ھ] ۲۲ برس کی عمر میں تحصیل علم کیا، پھر سماعت حدیث کے لئے مختلف ممالک خراسان، عراق، حجاز، مصر، شام، رے، بصرہ، کوفہ، بغداد، مکہ اور دمشق وغیرہ کی خاک چھانی۔ انہوں نے بھی متعدد کتابیں لکھیں لیکن سنن ابن ماجہ ان کی مقبول اور مستند ترین کتاب ہے۔ اس کا شمار بھی صحاح ستہ میں ہوتا ہے۔

(۷) امام مالک [۹۰-۱۷۹ھ] بڑے پایہ کے محدث تھے۔ ان کی مؤطا دنیا بھر میں مشہور ہے۔ تقریباً باسٹھ برس تک درس وتدریس اور فقہ وفتاویٰ میں مشغول رہے۔ بے شمار افراد نے ان سے تحصیل علم کیا۔ مدینہ منورہ میں کبھی سواری نہیں کہ جس ارض پاک پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدفون ہیں وہاں سوار ہونا خلاف ادب ہے۔ (دیکھیں حیات مالک از مولانا سید سلیمان ندوی)

(۸) امام ابن جریر طبری [۲۲۴-۳۱۰ھ] ایک بڑے مورخ تھے۔ تاریخ طبری ان کی بڑی معرکۃ الآراء کتاب ہے۔

(۹) ابن قتیبہ [۲۱۳-۲۷۶ھ] بڑے ادیب، عالم اور مصنف تھے۔ الشعراء والشعراء، ادب الکاتب وغیرہ ان کے بڑے تصنیفی کارنامے ہیں۔

(۱۰) احمد بن یحیٰی البلاذری [م: ۲۸۹ھ] بڑے عالم ومورخ تھے۔ متعدد تصنیفات ان کی یادگار ہیں۔ انساب الاشراف اور فتوح البلدان ان کا بڑا تصنیفی کارنامہ ہے۔

(۱۱) محمد بن اسحاق [۸۵-۱۵۱ھ] مشہور سیرت نگار اور امام فن مغازی تھے۔ فن مغازی کو انہوں نے بڑی ترقی دی۔

---

[۱۱]

نومسلموں کو دوبارہ ہندو ہو جانے سے بچانے کے لیے تمام برادران اسلام کی خدمت میں فریاد

اے برادران اسلام!

کبھی کبھی آپ کے کانوں میں بھنک پڑتی ہے کہ فلاں گاؤں میں مخالفوں نے نومسلموں کو آریہ بنالیا، آپ اس کو اتفاقی اور شاذ واقعہ سمجھتے ہیں، لیکن واقعی حالت یہ ہے کہ خاموشی کے ساتھ اس قسم کی کوشش کا ایک مسلسل، باضابطہ اور عالم گیر سلسلہ جاری ہے، جس کے نتائج اسلام کے حق میں نہایت خطرناک نظر آتے ہیں۔ اس کوشش کی کامیابی اس وجہ سے زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے کہ ہزاروں دیہات اور مواضع اس قسم کے ہیں جہاں کے نومسلم اسلام سے اس قدر بے خبر ہیں کہ ان کے نام لچھمن سنگھ اور دیال سنگھ ہوتے ہیں۔ انھوں نے عمر بھر کبھی کلمہ کا لفظ نہیں سنا، ان کے گاؤں میں اگر کوئی مسجد ہے تو اس میں کبھی نماز نہیں ہوتی، البتہ گوبر سے کبھی کبھی اس کی لپائی کر دی جاتی ہے۔ اس قسم کے دیہات راجپوتانہ، بیکانیر، الور، بھرت پور، حصار اور سلطان پور وغیرہ میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

میں نے اس امر کی تحقیق کے لیے اخباروں میں اشتہار دیا تو نہایت کثرت سے ان مقامات کے رہنے والوں کے خطوط آئے اور انھوں نے تفصیل کے ساتھ واقعات لکھے۔

یہ نومسلم اکثر راجپوت ہیں، وہ مسلمانوں کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھاتے، ان کی تمام رسمیں، طور اور طریقے ہندوؤں کے ہیں، وہ صرف اس علامت سے مسلمان خیال کیے جاتے ہیں کہ مردوں کو دفن کرتے ہیں، آگ میں نہیں جلاتے اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے تو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔

آریوں کے واعظ اور سفیر ان دیہاتوں میں جاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں ''تمہارے باپ دادا کو مسلمان بادشاہوں نے جبراً مسلمان بنالیا تھا، اب تم یہ ننگ کیوں گوارا کرتے ہو۔'' یہ جادو ان پر آسانی سے چل جاتا ہے اور وہ ہندو ہو جاتے ہیں۔

اس حالت کا قوم کو احساس ہوا اور جا بجا انجمنیں قایم ہوئیں، لیکن انھوں نے جو واعظ مقرر کیے وہ صرف شہروں میں دورہ کرتے ہیں، وعظ کہتے ہیں، آریوں سے مناظرہ کا اعلان دیتے ہیں، دیہات میں وہ اس لیے نہیں جا سکتے کہ دیہات میں جانے اور رہنے کی سختیاں وہ برداشت کرنے کے عادی نہیں۔ اگر چہ مناظرہ بھی خالی از فائدہ نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ تدبیر مرض کا اصلی علاج نہیں۔ یہ کام اس قدر دقت طلب ہے کہ ایک یا دو شخص کی رائے اس عقدہ کے حل کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اس لیے ضرور ہے کہ اکثر مقامات صاحب تجربہ اور اہل الرائے اور واقف کار حضرات ایک مقام پر جمع ہوں اور آپس میں مشورہ اور غور و مبادلہ خیالات کے بعد ایک مفصل خاکہ تیار کریں، جس کے موافق باقاعدہ اور وسیع کارروائی شروع کی جائے۔ اس کے لیے یہ مناسب موقع ہے کہ ۶/اپریل ۱۹۱۲ء سے ۸/اپریل تک ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس بہ مقام لکھنؤ منعقد ہوگا، جن حضرات کے دل میں اسلام کا درد ہے وہ اس موقع پر تشریف لائیں۔

جو تدبیریں اس وقت خیال میں آئیں ہیں وہ اس غرض سے پیش کی جاتی ہیں کہ تمام حضرات کو ان پر غور اور فکر کا موقع ملے۔ وہ تدبیریں حسب ذیل ہیں۔

۱- اس قسم کے واعظ مقرر کیے جائیں جو دو دو چار چار مہینے ایک گاؤں میں رہ کر

لوگوں کو اسلام کے احکام سکھائیں، اس قسم کے واعظوں کے تیار کرنے کا خاص انتظام ہونا چاہیے۔

۲- دودو چار چار گاؤں کے بیچ میں ابتدائی مدرسے قایم کیے جائیں، جن میں قرآن شریف اور اردو کی تعلیم دی جائے۔

۳- صوفی وضع لوگ بھیجے جائیں جن کا اثر عوام پر خود بخود پڑتا ہے۔

۴- مسلمانوں کے دیہات میں جو سرکاری ابتدائی مدرسے ہیں، کوشش کی جائے کہ ان کے مدرسین مسلمان مقرر ہوں۔ اب تک اکثر ہندو مدرس مقرر ہوتے ہیں اور اس لیے بچوں کو اسلام کی طرف رغبت نہیں ہوسکتی۔ غرض یہ ایک نہایت اہم مذہبی اور قومی مسئلہ ہے، اس کو نہایت غور، فکر اور جدوجہد سے حل کرنا چاہیے۔ اگر مسلمان ایسے خطرہ کی پرواہ نہیں کرتے تو ان کو اسلام کا نام نہیں لینا چاہیے۔

(مسلم گزٹ، ۱۱/ مارچ ۱۹۱۲ء)

تعلیقات و حواشی

شدھی تحریک کے زیر اثر راجپوتانہ اور بعض دوسرے علاقوں میں نومسلموں کے دوبارہ ہندو ہونے کی خبروں کا آغاز ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ علامہ شبلی اس خبر سے تڑپ اٹھے۔ چنانچہ شاہ جہاں پور اور رائے بریلی وغیرہ کا دورہ کیا۔ راجپوتانہ میں اپنے معتمد بھیجے کہ آریوں اور ان کی شدھی تحریک کا سدباب کیا جاسکے۔ اور کاموں کے ساتھ علامہ شبلی اس کام میں بھی مسلسل لگے رہے۔ (۶، ۷، ۸/ اپریل) ۱۹۱۲ء میں ندوہ کے جلسہ میں اسے ایک ملی مسئلہ کی شکل میں پیش کرنے کی غرض سے یہ مراسلہ لکھا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کی تفصیل دستیاب نہیں ہے۔ تاریخ ندوۃ العلما بھی اس کے ذکر سے خالی ہے۔

[۱۲]

مجلس علم کلام

مسلمانوں کے گذشتہ اور موجودہ زمانہ میں عجب قسم کا توارد وتشابہ ہے۔ عباسیوں کے زمانہ میں جب فلسفہ اور علوم عقلیہ کا رواج ہوا تو سینکڑوں ہزاروں اشخاص کے مذہبی عقائد متزلزل ہو گئے۔ آج بھی جب کہ یورپ کی تحقیقات اور خیالات قوم میں پھیل رہے ہیں، مذہبی عقائد میں ایک بھونچال سا آ گیا ہے۔

گذشتہ زمانہ میں جب یہ حالت پیدا ہوئی تو فقہا اور محدثین نے یہ فتویٰ دیا کہ فلسفہ کا پڑھنا پڑھانا حرام ہے۔ آج بھی مذہبی علما یورپ کے فلسفہ وسائنس کا سیکھنا برا سمجھتے ہیں اور علماء کے کثیر التعداد گروہ میں سے ایک شخص نے بھی یورپ کی کوئی زبان نہیں سیکھی، جس کے ذریعہ سے وہ فلسفہ حال سے واقف ہو سکتے۔

لیکن فقہا اور محدثین کا فتویٰ نہ چل سکا، ہزاروں آدمیوں نے یونانی فلسفہ پڑھا اور پڑھایا یہاں تک کہ فلسفہ کی تعلیم عام ہوگئی۔ آج بھی باوجود علما کی روک ٹوک کے انگریزی تعلیم عام ہو رہی ہے اور یہ سیلاب کسی کے روکے سے رک نہیں سکتا۔

قدیم زمانہ میں فقہا و محدثین نے گو فلسفہ کا پڑھنا اور علم کلام کا مرتب کرنا ناجائز قرار دیا، لیکن ایک گروہ پیدا ہوا جس نے علم کلام پر توجہ کی اور اس فن میں کتابیں لکھیں۔ یہ لوگ خود فلسفہ داں نہ تھے، لوگوں سے فلسفہ کے خیالات سن لیے تھے اور ان ہی پر تصنیف کا دارومدار رکھا تھا۔

امام اشعری (۱)، ماتریدی (۲)، امام الحرمین (۳)، باقلانی (۴) جو علم کلام کے بانی سمجھے جاتے ہیں، ان میں ایک بھی فلسفہ داں نہ تھا۔ آج بھی یہی حال ہے۔ مصر و ہندوستان میں نہایت قابل اور لایق بزرگوں نے جدید خیالات اور مسائل کے رد میں کتابیں لکھیں اور ان کی تصنیفات جدید علم کلام کی حیثیت سے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں، لیکن ان میں ایک بھی یورپ کی کوئی زبان نہیں جانتا اور لطف یہ کہ جو یورپ کی زبان جانتے ہیں وہ بھی ان ہی بزرگوں کی تصنیفات کے پیرو ہیں۔

یہاں تک تو قدیم و جدید واقعات میں تشابہ اور اشتراک ہے لیکن اب دونوں کی حدیں جدا ہوتی ہیں۔ قدیم زمانہ میں امام غزالی کے بعد علما نے نہایت جدوجہد سے فلسفہ کی تحصیل شروع کی، چنانچہ امام رازی (۵)، محقق طوسی، شیخ الاشراق وغیرہ فلسفہ میں اس رتبہ پر پہنچے کہ خود فلسفہ دانوں کو یہ مرتبہ حاصل نہ تھا، لیکن آج علما میں سے ایک شخص بھی ایسا موجود نہیں جس نے یورپ کا فلسفہ اور سائنس حاصل کیا ہو۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جدید علم کلام بالکل نامکمل اور ناقص ہے اور اگرچہ اس کا پورا علاج تو اس وقت ہوسکتا ہے جب ہمارے علما خود یورپ کے علوم وفنون میں کمال پیدا کرلیں لیکن چوں کہ اس میں ابھی دیر نظر آتی ہے، اس لیے اس وقت جو تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک کمیٹی قایم کی جائے جس کا نام ''مجلس علم کلام'' ہو۔

اس کمیٹی میں قدیم علما اور جدید تعلیم یافتہ دونوں گروہ کے لوگ ممبر ہوں۔ قدیم علما اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ جو عقائد اور مسائل فلسفہ کے خلاف بیان کیے جاتے ہیں، ان میں سے کون سے مسائل درحقیقت اسلام کے اصل عقائد ہیں اور کون سے نہیں۔ جدید تعلیم یافتہ گروہ اس بات کا فیصلہ کرسکے گا کہ جن چیزوں کو فلسفہ کے مخالف کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت فلسفہ کے مخالف ہیں بھی یا نہیں اور اگر ہیں تو فلسفہ کی تحقیقات کہاں تک یقینی اور قطعی ہے۔ اس کمیٹی کے لیے بزرگان ذیل انتخاب ہوسکتے ہیں:

علماء

۱-مولوی مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی (۶)

۲-مولانا مولوی شیر علی صاحب حیدر آباد، سابق مہتمم دارالعلوم ندوہ (۷)

۳-سید محمد رشید رضا صاحب مصری، ایڈیٹر "المنار" (۸)

جدید تعلیم یافتہ

۱-ڈاکٹر محمد اقبال صاحب بیرسٹر (۹)

۲-مولوی حمید الدین صاحب عربی پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد (۱۰)

۳-مولوی عبدالقادر صاحب بی.اے. بھاگل پوری (۱۱)

ہم کو خوشی ہے کہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے اس مجلس کی ممبری منظور کر لی ہے اور صاحبوں نے ابھی خط کا جواب نہیں دیا، لیکن امید ہے کہ کسی کو اس عمدہ کام کی شرکت سے انکار نہ ہوگا۔

ہم چاہتے ہیں کہ ملک کے اور حضرات جن کو اس تجویز سے دلچسپی ہو، ہم سے خط و کتابت کریں۔ جلسہ سالانہ ندوۃ العلما میں یہ تجویز پیش کی جائے گی اور جو فیصلہ ہوگا، اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

(مسلم گزٹ لکھنؤ ۴ / مارچ ۱۹۱۲ء)

تعلیقات و حواشی

علامہ شبلی کی علم کلام پر گہری نظر تھی۔ سلسلہ کلامیہ تصنیف کر کے وہ ملک میں ایک انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے جس میں اگرچہ انہیں پورے طور پر کامیابی نہ مل سکی تاہم اس کا خیال ان کے دل سے نہ گیا چنانچہ ۱۹۱۲ء میں دوبارہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ مراسلہ لکھ کر تمام اہل علم کو اس ضروری کام کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن یہ تحریک بھی اہل علم کی عدم توجہ کی وجہ سے محض تحریک ہی ہو کر رہ گئی اور کام آگے نہ

بڑھ سکا۔

(۱) علی بن اسماعیل الاشعری معروف بہ ابوالحسن اشعری[م۳۲۴ھ] امام اہل سنت۔انہوں نے عقیدہ اہل سنت کی تائید وحمایت اور معتزلہ کی عقلی دلائل سے تردید میں اہم کردار ادا کیا۔(دیکھیں سیر اعلام النبلاء، ج۵،ص۸۵-۹۰)

(۲) محمد بن محمد بن محمود ابو منصور الماتریدی[م۳۳۳ھ]علم کلام کے زبردست امام تھے۔معتزلہ کی تردید میں انہوں نے بھی بڑا زبردست کردار ادا کیا بالخصوص ماوراء النہر کے علاقہ میں عقیدہ اسلام کی صحیح ترجمانی میں اپنی ساری قوت صرف کردی۔(تفصیل کے لئے دیکھیں:الاعلام ج۷ص۱۹)

(۳) علم کلام کے امام تھے۔

(۴) یہ بھی علم کلام کے امام تھے۔

(۵) امام رازی: ابوعبداللہ فخر الدین رازی[۱۱۴۹-۱۲۰۹ء]علم کلام کے زبردست عالم تھے۔ان کی ذہانت وذکاوت مشہور ہے۔ان کا شمار اپنے وقت کے ائمہ متکلمین،فقہا اور علوم اسلامی کے بلند پایہ بزرگوں میں ہوتا تھا۔انہوں نے کثرت سے کتابیں تصنیف کیں۔مفاتیح الغیب تفسیر کبیر ان کا بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔(دیکھیں امام رازی از مولانا عبدالسلام ندوی)

(۶) شمس العلماء مولانا مفتی محمد عبداللہ ٹونکی[م:۷رنومبر ۱۹۲۰ء] کا شمار ہندوستان کے ممتاز علماء میں ہوتا ہے۔انہوں نے مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔اورینٹل کالج میں عرصہ تک پروفیسر رہے۔اخیر میں ندوۃ العلماء کے مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے۔درس وتدریس میں بڑی مہارت حاصل تھی،انتظامی صلاحیت بھی اچھی تھی۔(یادرفتگاں،ص۴۱)

(۷) مفتی شیر علی تلمیذ مولانا ہدایت اللہ رام پوری حیدرآباد کے ممتاز علماء اور علامہ شبلی کے دوستوں میں تھے۔ندوہ کے برسوں پرنسپل رہے۔معقولات میں یگانہ روزگار اور ریاضی سے بھی واقف تھے۔علامہ شبلی ان کے علم وفضل کے بڑے مداح تھے۔انہی کی کوشش وخواہش پر ندوہ کی صدارت قبول کی۔پھر کچھ دنوں بعد حیدرآباد واپس چلے گئے۔علامہ شبلی کی وفات کے بعد دوبارہ استاذ مقرر ہوئے۔

(۸) عالم اسلام کے ممتاز عالم ومصنّف اور شیخ محمد عبدہ کے شاگرد سید رشید رضا مصری [م:۲۲ر اگست ۱۹۳۵ء] مصر کے مشہور عالم ومفسر قرآن [تفسیر المنار] اور مجلّہ المنار مصر کے مدیر رہے۔ اصلاً شامی تھے۔ علامہ شبلی سے بڑے گہرے مراسم اور خط وکتابت تھی۔ انہی کی دعوت پر شیخ رشید رضا ۱۹۱۲ء میں ندوہ کے جلسہ میں تشریف لائے اور صدارت کی۔ یہ پہلا موقع تھا جب ندوہ کا تعلق عالم اسلام سے قائم ہوا۔

(یادرفتگاں، ص ۱۶۳)

(۹) علامہ اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] کے علامہ شبلی سے دیرینہ مراسم تھے۔ اس کا آغاز غالباً ۱۹۰۳ء میں ہوا جب علامہ اقبال نے اپنی کتاب علم الاقتصاد کی زبان وبیان کی تصحیح علامہ شبلی سے کرائی۔ (علم الاقتصاد ص ۲۶) اس کے بعد علامہ شبلی نے متعدد علمی منصوبوں میں اقبال کو شامل کیا مثلاً انجمن ترقی اردو کے ممتحنین میں ان کو شامل کیا، پھر وقف علی الاولاد کا وفد تجویز کیا تو اس میں بھی ان کو شامل کیا گو علامہ اقبال نے کسی وجہ سے معذرت کر لی۔ زیر نظر مراسلے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ انہیں مجلس علم کلام کا بھی رکن نامزد کیا تھا اور انہوں نے رکنیت قبول کر لی تھی۔ اصلاً ان دونوں بزرگوں میں علمی وفکری سطح پر ذہنی اتحاد تھا جو اخیر تک قائم رہا۔ (دیکھیں اقبال کامل از مولانا عبدالسلام ندوی)

(۱۰) علامہ حمید الدین فراہی اصلاً ترجمان القرآن اور بڑے عالم وفاضل شخص تھے۔ یہ علامہ شبلی کے ماموں زاد بھائی بھی تھے اور شاگرد بھی، علامہ شبلی کو ان سے بے پناہ تعلق تھا جیسا کہ مکاتیب سے ظاہر ہوتا ہے۔

علامہ شبلی کی وفات کے بعد اخوان الصفا قائم ہوئی تو علامہ فراہی ہی اس کے صدر نامزد ہوئے اور اخیر تک دارالمصنّفین کی منصب صدارت پر فائز رہے۔ تفسیر نظام القرآن ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ (دیکھیں ذکر فراہی از ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی)

(۱۱) مولوی عبدالقادر بی اے بھاگل پوری: تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

[۱۴]

سیرت نبوی

جناب من!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

سیرت نبوی جوزیر تصنیف ہے، میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تا کہ ان کے تائیدی بیان حسب موقعہ حجت الزامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انھوں نے غلطیاں اور بددیانتیاں کی ہیں، نہایت زور وقوت کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔

اسی بنا پر انگریزی کی کثرت سے تصنیفات مہیا کی گئی ہیں جو آنحضرت ﷺ کے متعلق تصنیف ہو چکی ہیں لیکن ان سب کا اردو میں ترجمہ کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے یہ رائے قرار پائی ہے کہ جن صاحبوں کو اس سے ذوق ہو، ان کے پاس ایک ایک کتاب بھیج دی جائے، وہ مطالعہ کر کے قابل ترجمہ مقامات پر نشانات کرتے جائیں اور پھر کتاب واپس بھیج دیں تا کہ دفتر کے مترجمین سے ترجمہ کرایا جائے۔

اس بنا پر آپ سے درخواست ہے کہ کیا آپ بھی اس کام میں حصہ لینا پسند فرمائیں گے۔

شبلی نعمانی

۱۴/اگست ۱۹۱۲ء

تعلیقات وحواشی

یہ مراسلہ کسی اخبار یا رسالہ میں نہیں لکھا گیا بلکہ دفتر سیرت نبوی سے وابستہ اہل قلم کے نام لکھا گیا تھا۔ان میں پروفیسر عبدالقادر،مولوی ریاض حسن خاں خیال،ایم مہدی حسن افادی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں،اس لئے کہ یہ مراسلہ ان کے نام مکاتیب شبلی میں درج ہے۔اس کا بنیادی مقصد سیرۃ النبی سے متعلق انگریزی کتابوں کے ان حصوں کا ترجمہ تھا جن میں مصنفین یورپ نے کذب بیانی سے کام لیا تھا۔

چنانچہ متعدد اہل علم نے اس ترجمہ کے کام میں حصہ لیا۔اس میں ایک اہم نام مولانا عبدالماجد دریابادی کا بھی ہے۔ان تراجم سے علامہ شبلی نعمانی نے استفادہ کیا اور سیرۃ النبیؐ میں جابجا مصنفین یورپ کی کذب بیانیوں کی تردید وتصحیح کا فریضہ انجام دیا۔

---

[۱۴]

تعطیل جمعہ

مسٹر غزنوی (۱) کے سوال کا گورنمنٹ کی طرف سے جو جواب دیا گیا اس کے بعد تعطیل جمعہ (نصف روز) کی ضرورت ہے یا نہیں۔؟

مسلمان ایک مدت سے اس بات کو محسوس کرتے تھے کہ جمعہ کے دن سرکاری عدالتوں کے کھلے رہنے سے مسلمان ملازموں کو عملاً ایک فرض مذہبی کے ادا کرنے سے باز رہنا پڑتا ہے، چنانچہ ایک دو سال سے اس کے متعلق مسلمانوں نے کوشش شروع کی۔ مسٹر غزنوی کی تحریک وسعی سے گورنمنٹ بنگال نے دو گھنٹہ کی چھٹی منظور کی۔ حال میں مسٹر غزنوی کے سوال پر گورنمنٹ ممبر نے کونسل میں کہا کہ گورنمنٹ بخوشی اس بات کو منظور کرے گی کہ جو مسلمان ملازم جمعہ کو نماز ادا کرنے کے لیے چھٹی طلب کرے اس کو اجازت دی جائے۔

اس کارروائی سے بعضوں کو یہ اطمینان ہو گیا ہے کہ اب جمعہ کی تعطیل (نصف روز) کی تحریک کی ضرورت نہیں رہی لیکن بہت سے لوگ ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اس کارروائی نے اصل مسئلہ کو حل نہیں کیا۔

گورنمنٹ کی طرف سے جو جواب دیا گیا ہے اس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان اپنے افسر سے جمعہ کے دن نماز کے لیے چھٹی طلب کرے وہ اس کو چھٹی دے دے گا لیکن یہ اجازت اور دو گھنٹہ کی عام تعطیل دو مختلف باتیں ہیں۔

اجازت کے حکم کا منشا یہ ہے کہ ہر ملازم کو ہر دفعہ جمعہ کے دن اجازت طلب کرنی پڑے گی۔ اس صورت میں یہ ظاہر ہے کہ خاص خاص حالات میں اکثر ملازموں کو خود اجازت طلب کرنے میں تامل ہوگا مثلاً جب وہ دیکھے گا کہ اس کا افسر مسلمان نہیں ہے اور اس کو کسی کی مذہبی پابندی کی بہ نسبت دفتر کے کام کے پورا ہونے کا زیادہ لحاظ ہوگا۔ اس صورت میں گو ملازم کو یہ یقین ہوگا کہ اجازت بہرحال مل جائے گی تاہم اس کو بار بار اجازت طلب کرنے میں پھر بھی تامل ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر یہ معلوم ہو کہ مسلمانوں کو جمعہ کے دن عام اجازت ہے تو بے تکلف ہر شخص اس اجازت سے مستفیض ہو سکے گا۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی اصلی خواہش یہ ہے کہ یہ دو گھنٹہ کی چھٹی مسلمان ملازموں کے ساتھ مخصوص نہ رہے بلکہ عام طور پر جمعہ کے دن آدھے دن کی تعطیل دے دی جائے۔ اس لیے کہ اگر یہ تعطیل مسلمانوں کے ساتھ مخصوص رہی تو مسلمان ملازموں کو یہ اندیشہ رہے گا کہ غیر مسلمان افسر ہمیشہ مسلمان ملازموں کو اپنی ماتحتی میں لینا پسند نہ کریں گے کیونکہ ان کو ہمیشہ یہ نظر آئے گا کہ ہر آٹھویں دن ایسے ملازموں کی وجہ سے سرکاری کاموں کے انجام دینے میں دو گھنٹے ضائع ہو جاتے ہیں۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم تمام اسلامی اخبارات اور اہل الرائے حضرات سے مستدعی ہیں کہ وہ بہ تفصیل و توضیح اس امر کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔ کیا گورنمنٹ کی معرفت اور محتاجِ اعادہ اجازت پر قناعت کرنی چاہیے یا عام تعطیل کی درخواست کرنی چاہیے اور یہ کہ اس پر اکتفا کرنا چاہیے کہ یہ نصف روزہ تعطیل مسلمانوں کے ساتھ مخصوص رہے یا عام کر دی جائے۔

شبلی نعمانی

(پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ماہنامہ معارف مارچ ۱۹۱۴ء ص ۲۳۳-۲۳۴/روزنامہ زمیندار۔ ۱۰/اپریل ۱۹۱۳ء)

تعلیقات وحواشی

یہ مراسلہ مولانا ظفر علی خاں کے رسالہ زمیندار لاہور میں شائع ہوا تھا۔اس میں دراصل اس بات پر بحث ہے کہ جمعہ کے دن ایک گھنٹے کی چھٹی ہونی چاہئے یا آدھے دن کی۔علامہ شبلی آدھے دن کی چھٹی کے حامی تھے۔دونوں میں کس پر عمل کیا جائے یا دونوں میں کون بہتر ہے۔اس غرض سے یہ مراسلہ لکھا گیا ہے۔

علامہ شبلی نے بڑے پیمانہ پر تعطیل جمعہ کی تحریک چلائی تھی۔اس دوران بنگال کونسل میں تعطیل جمعہ کے لئے دو گھنٹہ کی رخصت کی تجویز منظور ہوئی اس کے بعد علامہ شبلی نے یہ مراسلہ لکھا۔مراسلے پر بحث ہوئی یا نہیں اس کے بارے میں اطلاع نہیں۔اس کے بعد علامہ شبلی نے وفات پائی۔مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

> ''یہ کارروائی ابھی جاری تھی کہ مولانا نے انتقال کیا۔اس تحریک کا یہ اثر ہوا کہ اکثر صوبوں میں ملازمین کو نماز جمعہ میں جانے کی اجازت مل گئی یعنی اگر وہ چاہیں تو آدھ گھنٹے کی چھٹی لے کر جا سکتے ہیں اور اسکولوں میں یہ سفارش کی گئی کہ یا تو اسکول صبح سے ۱۲ر بجے تک ختم کر دیا جائے یا ایک بجے جولڑکے اور مدرس نماز کو جانا چاہیں ان کو آدھ گھنٹے کی چھٹی دے دی جائے۔''
>
> (حیات شبلی ص ۵۲۱)

(۱) مسٹر غزنوی: تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

[۱۵]

حرم محترم میں

جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی) کی تجویز

واقعات حال نے ایک ایک شخص کو آنکھوں سے دکھا دیا کہ اسلام (یعنی مسلمان) آفتاب لب بام ہورہا ہے۔اور اگر عام مسلمان اپنی تمام قوت ایک اجتماعی صورت میں صرف نہ کریں گے تو اب ان کی بقا کی امید نہیں۔ یہ خیال عام ہوتا جاتا ہے لیکن افسوس ہے کہ تدبیر میں اختلاف ہے اور کوئی خاص مشترک رائے نہیں قائم ہوتی۔

میرے نزدیک سب سے مقدم تجویز یہ ہے کہ مکہ معظّمہ میں ایک جامعہ اسلامیہ قائم کی جائے جس میں تمام مذہبی اور دنیوی (جن میں علوم جدیدہ بھی شامل ہیں) علوم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہو۔

یہ ظاہر ہے کہ آج کل ہر قسم کی قوت علم پر موقوف ہے اور دراصل علم ہی اصلی طاقت ہے۔اس لیے آج کل ہر قوم کی بقا اسی پر موقوف ہے کہ وہ تمام علوم وفنون میں کامل ہو۔

مکہ معظّمہ میں جامعہ اسلامیہ کے قائم کرنے کی ترجیح کی متعدد وجوہ ہیں:

۱- مکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا مرکز ہے اور ہر ملک کے مسلمان بہ شوق ورغبت وہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاسکتے ہیں، مصر یا قسطنطنیہ یا کسی اور مقام میں یہ کوشش نہیں ہوسکتی۔

۲-جس قدر سرمایہ کثیر مکہ معظّمہ کی جامعہ کے لیے مہیا ہوسکتا ہے اور کسی مقام کے

لیے نہیں ہوسکتا۔

۳- ہر سال حجاج سے اگر صرف دس روپیہ فی کس وصول ہو تو لاکھوں کی رقم وصول ہوسکتی ہے۔

۴- مکہ معظّمہ میں نہایت عمدہ کتب خانہ موجود ہے۔

۵- مکہ معظّمہ سے قریب طایف نہایت سرد اور خوشگوار مقام ہے اور گرمیوں کے زمانہ میں طلبہ اور اساتذہ وہاں بسر کر سکتے ہیں۔

۶- بڑا مقصد اس تجویز سے یہ حاصل ہوگا کہ عرب کے تمام قبائل جو ہزاروں برس سے اب تک جاہل رہتے آئے ہیں ان میں تعلیم پھیلے گی اور اس غرض کے لیے مختلف بڑے بڑے قبائل میں جامعہ اسلامیہ کی شاخیں قائم کی جائیں گی۔ اعراب اور بدوؤں کو وظایف کے ذریعہ سے علم کی ترغیب بہ آسانی ہوسکتی ہے۔

اس کام میں کسی قدر دقت یہ ہے کہ ٹرکی کی گورنمنٹ مشکل سے اس کی اجازت دے گی کیونکہ ترکوں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ عربوں میں علم وتہذیب پھیلنے پائے، چنانچہ بڑے بڑے صدر مقامات عرب میں ایک بھی بڑا سرکاری مدرسہ نہیں۔ لیکن اب ترکوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں پر اپنی جاں نثاری کے اتنے حقوق قائم کر دیے ہیں کہ اگر تمام مسلمان متفقاً اس قسم کی درخواست ترکی سے کریں تو وہ انکار نہ کر سکے گا۔

یہ بھی ضرور ہے کہ اس تجویز کو کسی قسم کا پولیٹیکل رنگ نہ دیا جائے۔ یہ صرف ایک علمی تجویز ہے اور یوں تو آج کل ایک ایک بات یہاں تک کہ آب وہوا بھی پولیٹیکل بن گئی ہے، اس کا کہاں تک لحاظ کیا جا سکتا ہے۔

اگر یہ تجویز پسند کے قابل ہو تو سب سے پہلے اسلامی اخباروں سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ تمام قوم کو اس کی طرف متوجہ کریں اور پھر بالخصوص قومی درد والوں مثلاً آغا خاں

صاحب (۱)، راجہ علی محمد خاں صاحب (۲)، نواب صاحب ڈھاکہ (۳) ، قزلباش خاں (۴)، نواب وقار الملک، آفتاب احمد خاں (۵) ، مسٹر محمد علی (۶)، ایڈیٹر صاحب الہلال (۷) سے استدعا کرتا ہوں کہ یہ کام آپ سے زیادہ مفید اور سب سے زیادہ ممکن الحصول ہے۔

میں بہ ایں ضعف اور شکستہ پائی یہ کرسکتا ہوں کہ اس تحریک کے لیے تمام ہندوستان کا دورہ کروں اور پھر ہجرت کر کے مکہ معظّمہ چلا جاؤں اور اس مبارک جامعہ میں جاروب کشی کی خدمت انجام دوں۔

(پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ماہنامہ معارف نومبر ۱۹۱۳ء، ص ۳۸۴-۳۸۵/ روزنامہ زمیندار، ۱۵/اپریل ۱۹۱۳ء)

تعلیقات و حواشی

یہ مراسلہ بھی زمیندار لاہور میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے مکہ مکرمہ میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کس قدر اہم مراسلہ ہے۔ البتہ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس مراسلہ کا ذکر حیات شبلی میں نہیں ہے۔ حال ہی میں اسے دارالمصنّفین کے فاضل ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے دریافت کیا ہے۔ اس مراسلہ پر اخبارات میں بحث و مباحثہ بھی ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد مدرسہ صولتیہ کو ترقی دینے کے خواہش مند تھے جسے مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے قائم کیا تھا۔ جیسا کہ انہوں نے الہلال میں لکھا ہے۔ اس پر مزید کسی اور نے اظہار خیال نہیں کیا۔

(۱) آغا خان [۱۸۷۷-۱۹۵۷ء] اسماعلیہ فرقہ کے امام اور بڑے بااثر شخص تھے۔ ان کا شمار اپنے عہد کے ممتاز ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ ۲/نومبر ۱۸۷۷ء کو بمقام ٹیکری کراچی میں پیدا ہوئے۔ گھر پر

انگریزی، فرانسیسی اور عربی وفارسی کی تعلیم پائی اور ان زبانوں میں بڑی مہارت پیدا کی۔ اپنے والد آغا شاہ کے بعد ۱۸۸۵ء میں اسماعلیہ فرقہ کے امام مقرر ہوئے۔ یہ انگریزوں کے بڑے وفادار تھے تاہم انہیں مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کا بھی ہمیشہ خیال رہا اور اس کے لئے جدوجہد کی۔ عرصہ تک مسلم لیگ سے وابستہ رہے تاہم ہندو مسلم اتحاد کے بھی علمبردار رہے۔ گول میز کانفرنس اور جمیعۃ اقوام میں ہندوستان کی نمائندگی بھی کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک پرو وائس چانسلر رہے۔ ۱۹۵۷ء میں انتقال کیا۔ (حواشی کلیات مکاتیب اقبال، ج ۲،ص ۲۵-۲۶۷)

(۲) راجہ علی محمد خاں: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۳) نواب خواجہ سر سلیم اللہ خاں [۱۸۸۴-۱۹۱۶ء] ڈھاکہ کے نواب تھے۔ آبائی وطن کشمیر تھا۔ انگریزوں نے سر کا خطاب دیا تھا۔ بڑے بااثر شخص تھے۔ ۱۶/جنوری ۱۹۱۶ء کو کلکتہ میں وفات پائی۔ تدفین خاندانی قبرستان ڈھاکہ میں ہوئی۔

(۴) قزلباش خاں: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۵) صاحبزادہ آفتاب احمد خاں [۱۸۶۷-۱۹۳۰ء] بڑے لائق شخص تھے۔ انہیں سر سید احمد خاں نے مدرسۃ العلوم کا ٹرسٹی مقرر کیا تھا جس پر وہ طویل عرصہ تک فائز رہے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ضلع کرنال کے رہنے والے تھے۔ علی گڑھ کالج سے تعلیم کے بعد لندن گئے۔ کیمبرج سے تاریخ کی سند لی۔ واپس آکر علی گڑھ میں وکالت شروع کی اور مسلمانوں کی سیاست میں بھی حصہ لینے لگے۔ ۱۹۲۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ انہیں تعلیمی مسائل سے بڑی دلچسپی تھی۔ پراونشیل مسلم ایجوکیشن کانفرنس اور انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت بھی کی۔ ۱۸/جنوری ۱۹۳۰ء میں فالج کے حملہ میں وفات پائی۔ (یادرفتگاں،ص ۹۵)

(۶) مولانا محمد علی جوہر [۱۸۷۸-۱۹۳۱ء] علامہ شبلی کے شاگرد، ادیب، شاعر، خطیب، سیاست داں اور عظیم محبِّ وطن تھے۔ رام پور میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ کالج اور آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔ انگریزی ہفت روزہ کامریڈ اور ہمدرد جاری کیا۔ تحریک خلافت دراصل علی برادران کا دوسرا نام ہے۔

کانگریس کے حامی تھے۔ یہ بات خاص طور پر ذکر کے قابل ہے کہ محمد علی کانگریس کے حامی ہی نہیں بلکہ اس کے صدر بھی رہے۔ انگریزوں کے خلاف مضمون لکھنے کی پاداش میں نظر بند کئے گئے۔ انہوں نے عدم تعاون تحریک کے لئے علی گڑھ کالج کے طلبہ کو ہم خیال بنا کر کالج سے علاحدہ ہونے کے لئے تیار کیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے یہ اعلان کرکے کہ برطانوی حکومت کی نوکری حرام ہے، انگریزی حکومت کو چیلنج کر دیا جس کے نتیجہ میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ سائمن کمیشن کی زبردست مخالفت کی۔ چار سال نظر بند رہے۔ ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس میں شریک ہوکر انگریزوں کے سامنے اعلان کیا کہ ''میں اپنے ملک واپس نہیں جاؤں گا یا تو ہندوستان کو ڈومنین اسٹیٹس دو ورنہ میرے لئے ایک قبر کھود دو میں غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔'' چنانچہ وہیں لندن میں ۴؍جنوری ۱۹۳۱ء کو انتقال کیا۔ ان کی نماز جنازہ مصر میں اور تدفین بیت المقدس میں ہوئی۔ علامہ شبلی کے خاص شاگردوں میں تھے۔ اور انہیں اپنے استاذ پر فخر تھا۔ وہ اس کا ذکر بھی کرتے رہتے تھے۔

علامہ شبلی کے سیاسی خیالات کو جن لوگوں نے پروان چڑھایا، ترقی دی، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ ایک اہم نام مولانا محمد علی جوہر کا بھی ہے۔

(دیکھیں علی برادران از رئیس احمد جعفری)

(۷) امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸–۱۹۵۸ء] ایک جامع الصفات شخص تھے۔ ایسے اشخاص مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ علم وادب، تعلیم وتربیت، علوم وفنون، تاریخ وتمدن، سیاسیات کون سا موضوع تھا جو مولانا آزاد کی دسترس سے باہر تھا۔ وہ ۱۱؍نومبر ۱۸۸۸ء کو مکہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ ۱۸۹۸ء میں ہندوستان آئے اور علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ ایک صحافی کی حیثیت سے علمی زندگی کا آغاز کیا۔ ان میں شروع سے حریت وآزادی کے جذبات موجزن تھے، چنانچہ سیاست میں اس قدر دلچسپی سے حصہ لیا کہ آل انڈیا کانگریس کے سب سے کم عمر صدر قرار پائے۔ ۱۹۱۲ء میں الہلال جاری کرکے ملک میں انقلاب پیدا کیا۔ وہ صاحب طرز ادیب وانشا پرداز اور شعلہ بیان خطیب تھے۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں سے مسلمانوں کی تعمیر وترقی اور ملک کی آزادی وسالمیت کا کام

لیا۔ کئی بار قید و بند اور زنداں کی صعوبتیں اٹھائیں۔ ملک آزاد ہوا تو وہ پہلے وزیر تعلیم بنائے گئے۔ اس اہم عہدہ کو انہوں نے جس طرح نبھایا اور جس طرح تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی وہ ہمارے ملک کی تاریخ کا بڑا عظیم الشان باب ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کمیشن مقرر کیا۔ آل انڈیا کونسل فار ٹیکنکل ایجوکیشن، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی اور ملک میں متعدد سائنسی تجربہ گاہوں کا قیام انہیں کا کارنامہ ہے۔ ساہتیہ اکادمی، سنگیت ناٹک اکیڈمی اور کلا اکیڈمی وغیرہ ادبی ادارے انہیں کے قائم کئے ہوئے ہیں۔ انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز انہی کی ایما پر قائم ہوئی۔ غرض تعلیم وتہذیب اور ثقافت کے میدان میں انقلاب انہی کا برپا کیا ہوا ہے۔

وہ ایک بڑے مصنف تھے۔ تذکرہ، غبار خاطر، کاروان خیال اور تفسیر ترجمان القرآن ان کے شاہکار ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ شبلی سے ان کے انتہائی گہرے تعلقات تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے والد کے بعد سب سے زیادہ جسے عزیز رکھا اور جس کی تکریم کی وہ علامہ شبلی کی ذات گرامی ہے۔ ہندوستان کی سیاسیات میں علامہ شبلی پہلے شخص ہیں جنہوں نے تعصب اور تنگ نظری کے خلاف آواز بلند کی۔ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور کانگریس کی حمایت کی۔ یہی کام مدۃ العمر مولانا آزاد نے بھی کیا۔ ہندو مسلم اتحاد کو سب سے بلند آہنگ طریقہ سے علامہ شبلی نے اپنے مضمون مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ میں پیش کیا تھا۔ مولانا آزاد ۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی کی خواہش پر ندوہ لکھنو آئے اور علامہ شبلی کے ساتھ قیام کیا۔ اصلاً یہیں خود آزاد کی زندگی میں انقلاب آیا، مولانا شبلی کے اثرات ان پر آخر تک قائم رہے۔ ۲۲رفروری ۱۹۵۸ء کو ہندوستان کا یہ درخشاں ستارہ غروب ہوا۔

[۱۶]

مدینہ یونیورسٹی کا نصاب تعلیم

بخدمت بزرگان قوم

آپ صاحبوں نے اخباروں میں ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ مدینہ منورہ میں ترکی گورنمنٹ جو جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی اسلامی) بنانا چاہتی ہے اس کے متعلق ہم تینوں شخصوں (۱) سے بذریعہ تار کے قسطنطنیہ سے پروگرام نصاب تعلیم مانگا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ ایک نہایت اہم کام ہے اور اس کے لیے ضرور تھا کہ ہندوستان کے نہایت قابل علماء اور تعلیم یافتگان جدید کسی موقع پر جمع ہوتے اور پہلے سے یادداشتیں تیار کر کے لاتے اور پھر باہمی مشورے اور گفتگو سے ایک مکمل پروگرام تیار ہو کے وہاں بھیجا جاتا۔ لیکن چونکہ بظاہر اس وقت اس کی امید نہیں معلوم ہوتی کہ ایسا مجمع جمع ہو سکے، اس لیے میں حضرات علماء اور تعلیم یافتگانِ جدید سے درخواست کرتا ہوں کہ ایسے جامعہ کے متعلق جو اصولی باتیں ان کے خیال میں آئیں بذریعہ اخبار زمیندار یا دیگر اخبارات کے شائع فرمائیں۔ اور اگر کوئی صاحب چاہیں تو پرائیویٹ طور پر بذریعہ ذاتی خطوط کے مجھے مطلع فرمائیں۔ دیگر اخبارات سے امید ہے کہ وہ اس خط کو شائع فرمائیں۔

شبلی نعمانی

۱۸/ مئی ۱۹۱۳ء

نیونا گپاڑہ، بھائی کلہ، اکبر بلڈنگ نمبر۲ بمبئی

۱۸مئی ۱۹۱۳ء

(پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ماہنامہ معارف، دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۴۶۹-۴۷۰/ روزنامہ زمیندار ۲۲مئی ۱۹۱۳)

تعلیقات و حواشی

۱۹۱۳ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا ظفر علی خاں کی کوششوں سے ترکی حکومت نے مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کے قیام کی تجویز منظور کی۔ شیخ عبدالعزیز شاویش اس کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور علامہ شبلی، مولانا حمیدالدین فراہی اور علامہ اقبال کو یونیورسٹی کا نصاب تعلیم تیار کرنے کے لئے ترکی حکومت نے منتخب کیا۔ علامہ شبلی اسے ایک قومی مسئلہ خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اس نصاب کے سلسلے میں انہوں نے مذکورہ بالا مراسلہ زمیندار لاہور میں لکھا تاکہ اس پر مزید بحث ومباحثہ ہو۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ (مدینہ یونیورسٹی کے سلسلے میں مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ماہنامہ معارف، دسمبر ۲۰۱۳ء ص ۴۶۲-۴۷۲)

(۱) علامہ شبلی، علامہ اقبال اور علامہ حمیدالدین فراہی۔

---

[۱۷]

مولانا عبدالباری کی شہادت

الندوہ کے مضمون کے متعلق میرے خلاف جوطوفان برپا کیا گیا، اس کے متعلق اب تک اس وجہ سے کوئی مفصل تحریر شایع نہ کرسکا کہ سخت بیمار تھا۔ اس کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ جس قدر تحریریں مخالفت میں نکلتی تھیں، کسی ذمہ دار اور شریک واقعہ شخص کی نہ تھیں، اس لیے میں ان لوگوں کے مقابلہ میں کچھ لکھنا بے سود سمجھتا تھا، لیکن اب مولوی عبدالباری (۱) نے مسلم گزٹ (۲) میں اپنا مفصل بیان درج کرایا ہے۔ مولوی صاحب موصوف کا بیان متعدد وجوہ سے قابل لحاظ ہے۔

۱- وہ میرے مخالف گروہ کے ایک بہت بڑے ممبر ہیں اور اس واقعہ کو بدنما صورت میں پھیلانے میں ان کی کوششوں کو خاص دخل ہے۔ اسی کے ساتھ مولوی عبدالکریم صاحب (۳) کی معطّلی وغیرہ کے متعلق جو غیر معمولی اجلاس ندوہ کا ہوا تھا، اس کے پانچ ممبروں میں سے ایک مولانا بھی تھے اور جو کارروائیاں اس وقت تک عمل میں آئیں ان میں شریک تھے، لیکن ان کی نسبت لوگوں نے یہ تاویل کی کہ ان کو دھمکی یا فریب دے کر اپنا ہمزبان بنالیا تھا۔ ان اسباب سے ان کی شہادت کے متعلق میں ایک مفصل تحریر شایع کرسکوں گا۔

اس معاملہ میں جو فرد قرار داد جرائم میرے اوپر قایم ہے اس میں سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ میں نے دیگر ارکان (شریک فیصلہ مقدمہ) کو دھمکی دے کر اپنا ہم زبان بنالیا

اور تمام امور اپنی مرضی کے مطابق فیصل کرائے، چناں چہ لکھنؤ سے ایک لوکل اخبار میں اڈیٹوریل نوٹ اس سرخی سے نکلا تھا: ''مولانا شبلی کی دھمکی''۔

اصول شہادت کے متعلق اس واقعہ کی تحقیق کا اصل ذریعہ یہ تھا کہ خود ان لوگوں سے دریافت کیا جاتا، جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ میں نے ان کو دھمکی دی یا ان کو مجبور کیا، لیکن پبلک کو اس دردسر کی کیا ضرورت تھی؟ غنیمت ہے کہ یہ تکلیف مولانا نے خود گوارا کی۔

مولانا کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے اور یوں بھی ہم ارادت مند قیاس کر سکتے تھے کہ مولانا کی ذات گرامی مختلف شؤن وحیثیات رکھتی ہے۔ ایک وہ عالم ہے کہ ''بالملکوتیاں نہ پرداختے'' اس شان کو مولانا ان الفاظ میں ظاہر فرماتے ہیں:

> ''اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں نے تمام تعلقات حکومت سے قطع کر دئے ہیں مگر آپ لوگوں کا طرز عمل ایسا نہیں ہے، آپ ان کی خوشنودی کے محتاج ہیں، بلا رورعایت جو امر حق ہو اس کو ظاہر کروں، چاہے وہ گورنمنٹ کے موافق ہو یا مخالف۔''

دوسرا وہ عالم ہے جس میں مولانا اس درجہ سے تنزل کر کے عالم ناسوت میں تشریف لاتے ہیں، اس شان کو مولانا نے ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے:

> ''اس واسطے اگر یہ معاملہ فرنگی محل کا ہوتا تو میں کوئی پروانہ کرتا مگر ''ندوہ'' کا معاملہ ہونے کی وجہ سے مجھے بہت سوچ کر رائے قایم کرنا ہے۔''

لیکن بہر حال یہ دونوں شؤن بذات خود قایم ہیں، اس کو کسی کی دھمکی اور ڈراؤ سے کوئی واسطہ نہیں۔ مولانا نے اگر چہ اپنی شہادت میں حسن تاویل اور شان نزول کی تفصیل سے بہت کام لیا ہے، وذلك شان العلم اذا توسع وتفنن، تاہم اصل معاملہ پر اس سے بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اصل بحث یہ ہے کہ جو تجویزیں منظور ہوئیں وہ مولانا نے بھی منظور

فرمائی تھیں یا نہیں؟ اس امر سے بحث نہیں کہ منظور کرنے کا شان نزول کیا تھا؟ اور مولانا نے اس کے متعلق کیا کیا گفتگو فرمائی تھی؟ کیوں کہ یہ تو بہر حال مسلم ہے کہ مولانا جس شان سے ''ندوہ'' کے ممبر ہیں اور ''ندوہ'' کے جلسوں میں تشریف لاتے ہیں، وہ ''با ملکوتیاں نہ پرداختی'' والی شان نہیں ہے۔ اس میں مصالح وقت، ضروریات زمانہ، مکروہات گردوپیش سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور اسی عالم میں ہم لوگوں کو جناب کی ہم بزمی کا شرف حاصل ہے اور یوں تو فرشتگان بابل بھی پہلے "نحن فتنة فلاتكفر" کا عذر کرتے ہیں، لیکن درخواست کنندہ کے اصرار و خواہش پر بہر حال جادو سکھا ہی دیتے ہیں۔

معاملہ زیر بحث میں سب سے زیادہ پبلک کی ناراضی اس بات پر ہے کہ گورنمنٹ کو اس معاملہ کی خبر کیوں کی گئی اور اس کو مداخلت کا موقع کیوں دیا گیا؟ اور حقیقت میں یہی چیز ہے، جو دیگر اور تمام کارروائیوں کا سنگ بنیاد ہے۔ گورنمنٹ کے خبر کر دینے کے بعد بقیہ تمام کارروائیاں خود بخود ضروری تھیں چناں چہ ان ممبروں کے ہاتھ سے انجام پائیں جو میری مخالف پارٹی کے قائد العسکر ہیں، اس کے متعلق مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

> ''اس کے بعد مولوی شبلی صاحب نے الندوہ کے مضمون جہاد کا ذکر چھیڑا اور فرمایا کہ اس بات میں کیا رائے ہے؟ اس کی اطلاع حکام کو کی جائے یا نہ کی جائے؟ اس کے جواب میں میں نے کہا کہ حکام کو چاہیں آپ اطلاع کریں یا نہ کریں، ایسے امور کی اطلاع ہو ہی جاتی ہے۔''

پہلے یہ گذارش ہے کہ واقعہ کی یہ صورت نہیں اور چوں کہ مولانا کے عالم قدس کا بیان نہیں ہے، اس لیے سہو ونسیان کا ہو جانا ممکن ہے۔ واقعہ کی یہ صورت ہے کہ جب جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی تو سب سے پہلے میں نے تمام ارکان موجودہ کو مخاطب کر کے کہا کہ اس معاملہ میں کارروائی کرنے کے دو طریقے ہیں اور غور کر لیجیے کہ آپ لوگوں کو دونوں میں سے کون طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ مولوی عبدالکریم صاحب کی نسبت جو کچھ کرنا چاہیں بطور خود کرلیں اور اس کی کارروائی دفتر میں موجود رہے تا کہ اگر کبھی گورنمنٹ استفسار کرے تو جواب دینے کا موقع حاصل رہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ گورنمنٹ کو خبر کریں، لیکن اس میں یہ احتمال ہے کہ مضمون جہاد کا وہاں ترجمہ کرایا جائے اور ممکن ہے کہ کوئی مترجم غلط ترجمہ کرے، اس صورت میں مضمون ممکن ہے کہ خطرناک ہو جائے۔

میری اس تقریر پر مولانا نے فرمایا کہ ''آپ سمجھتے ہیں کہ اس مضمون کا ترجمہ اب تک نہ ہو چکا ہوگا، یا نہ ہو رہا ہوگا۔'' مولانا کے ساتھ اور تمام ارکان نے بھی تائید کی صدائیں بلند کیں اور آخر طے ہوا کہ ڈپٹی کمشنر صاحب کو اس کی اطلاع دی جائے۔

لیکن اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تقریر کی وہی صورت تھی جو مولانا نے بیان کی تاہم اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ گورنمنٹ تک اس معاملہ کو پہنچانا مولانا کے نزدیک چنداں جرم نہ تھا اور بہرحال وہ تجویز درج کارروائی کی گئی تو مولانا نے اس سے اپنی برأت نہیں فرمائی۔

تجاویز منظور شدہ میں دوسرا امر یہ تھا کہ مضمون مذکور ندوہ کے مقاصد واغراض کے خلاف ہے۔

جو لوگ مذہبی حیثیت کی وجہ سے اس معاملہ میں سخت ناراضی کا اظہار کر رہے ہیں ان کی برہمی کی وجہ یہی ہے کہ ان کے نزدیک مضمون مذکور ایک مسئلۂ مذہبی ہے، اس کو مقاصد اور اغراض ندوہ کے خلاف کہنا کس قدر افسوس ناک ہے۔

جناب مولانا کی شہادت اس مسئلہ کے متعلق یہ ہے:

''میں خود اس کے متعلق دوسری رائے رکھتا ہوں، مگر موجودہ زمانہ کے اعتبار سے اور مضمون جہاد ہونے کے باعث ایسے مضامین کی اشاعت

ندوہ کے مقاصد واغراض کے خلاف ہے اوراس لیے بھی ضرور خلاف ہے
کہ اس کے لیے گورنمنٹ سے پانچ سوروپئے بہت غنیمت ہیں۔''

مولانا کا پہلا فقرہ کہ ''میں خود اس کے متعلق دوسری رائے رکھتا ہوں'' یہ تو وہی عالم قدس کی واردات ہیں، لیکن ہم کو اس عالم سے بحث ہے جس میں مولانا عالم ملکوت سے تنزل فرما کر ندوہ کے ارکان میں شامل ہوتے ہیں اور ندوہ کی تجاویز اور ریزولیوشن وغیرہ منظور یا نامنظور فرماتے ہیں۔ اس عالم میں مولانا کا بھی ارشاد یہی ہے کہ ایسے مضامین کی اشاعت ندوہ کے مقاصد واغراض کے خلاف ہے، اگرچہ افسوس ہے کہ ندوہ کے اغراض و مقاصد جو علاحدہ چھپ کر شایع ہو چکے ہیں، اس میں اس مقصد کا جو مولانا بیان کرتے ہیں، کہیں ذکر نہیں، مولانا نے اس سے اوپر کی عبارت میں ایک موقع پر فرمایا ہے:

''ندوہ کی غرض اگر صرف تعلیم دینی ہوتی تو کوئی پروانہ تھی، مگر اس وقت
اس کے مقاصد میں گورنمنٹ کا خوش رکھنا بھی ہے۔''

ندوہ کے اغراض و مقاصد جو کل پانچ ہیں، ایک چوورقہ پر جلی خط میں چھپ کر کثرت سے شایع ہو چکے ہیں اور اب تک شایع ہوتے رہتے ہیں۔ مولانا کئی برس سے ندوہ کے ممبر ہیں اور اکثر جلسوں میں شریک ہوتے رہے ہیں اور ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے، جب مولانا کی بعض ناکام کوششوں سے لوگوں کو یہ امید بندھی تھی کہ اس کی سکریٹری شپ کو عزت دینے کے لیے آمادہ ہیں۔ اس لیے مولانا کی خدمت میں بہ ادب گذارش ہے کہ گورنمنٹ کا خوش رکھنا ندوہ کے مقاصد پنج گانہ میں سے کون سا مقصد ہے؟

اخیر بحث مولوی عبدالکریم صاحب کی معطّلی کی ہے۔ اس کی نسبت مولانا ایک طول طویل تقریر کے بعد فرماتے ہیں:

''میں نے کہا معطل کرنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے، اس پر بحث ہونے
سے معلوم ہوا کہ ناظم کو اختیار ہے۔ اس پر مولوی شبلی صاحب نے فرمایا کہ

اچھا آپ (مولوی عبدالحی صاحب) معطّلی کا حکم لکھ دیں، مولوی عبدالحی
صاحب نے اس کو منظور کیا، میں ہرگز نہیں سمجھ سکتا ہوں کہ معطّلی کس طرح
ہماری طرف منسوب ہوگئی۔''

مولانا کی اس تصریح سے اس قدر ثابت ہے کہ معطّلی کا حکم دینا مولوی عبدالحی صاحب نے منظور کیا تھا، ان کو بوجہ اس کے کہ نائب ناظم ہیں، یہ اختیار حاصل تھا، لیکن مولانا کو شاید یہ معلوم نہیں کہ جب کسی انجمن کا کوئی عہدہ دار اپنے حد جواز سے انجمن کے اجلاس میں بحیثیت اپنے عہدہ کے کوئی حکم دے گا تو وہ انجمن کی طرف سے سمجھا جائے گا، جب تک کہ کوئی ممبر اس حد جواز کا منکر نہ ہو یا ممبری سے کنارہ کش نہ ہو جائے۔

اخیر میں مجھ کو سخت تعجب یہ ہے کہ مولانا کی اس قدر مفصل شہادت اور بیانات کا جلسۂ انتظامیہ ۹/مارچ ۱۹۱۳ء کی روداد میں جس میں مولانا شریک تھے اور جو چھپ کر شائع ہو چکی تھی کہیں ذکر نہیں ہے، مولانا کو یہ بیانات یا اس کے اہم ٹکڑے اس جلسہ کی روداد میں درج کرانے چاہئیں تھے تاکہ سب پر حجت ہو سکتی۔ روداد مذکور سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ (بجز ایک خاص لفظ کے) باقی تمام ارکان خمسہ تمام کارروائیوں میں شریک تھے اور اس لیے ان کارروائیوں کے متعلق جہاں لکھا گیا ہے کہ کالعدم قرار دی گئیں، وہاں یہ الفاظ ہیں:

''اس جلسہ کی کارروائی میں کل کارروائی جلسۂ غیر معمولی منعقدہ ۸/جنوری
۱۹۱۳ء و کارروائی معتمد صاحب دارالعلوم نسبت معطّلی مولوی عبدالکریم
صاحب خلاف دستور العمل ندوۃ العلما بغیر کسی اختیار کے عمل میں لائی گئی
ہے، لہٰذا کالعدم سمجھی جائے۔''

عبارت مذکور میں یہ امر بھی خصوصیت کے ساتھ قابل لحاظ ہے کہ اس جلسہ نے جلسۂ غیر معمولی کی جو کارروائی کالعدم قرار دی، اس کی وجہ یہ نہیں بیان کی کہ وہ نامناسب اور بے جا تھی، بلکہ یہ بیان کی دستور العمل کے رو سے اس جلسہ کو اس کارروائی کا اختیار حاصل نہ

تھا، کیوں کہ دستور العمل کے رو سے جلسۂ انتظامیہ کے سوا کسی جلسہ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اور جلسۂ انتظامیہ کے لیے سات ممبروں کے جمع ہونے کی شرط ہے اور اس جلسۂ غیر معمولی میں صرف پانچ ممبر شریک تھے۔

بہر حال مولانا کے اظہار سے کچھ نہ کچھ اصل حقیقت ظاہر ہوئی ہے اور اگر بقیہ ارکان اربعہ بھی اپنے بیانات شایع کر دیں تو اصل حقیقت قطعاً منکشف ہو جائے گی اور اب تک تو جن لوگوں نے جو کچھ بطور شہادت کہا ہے، سب وہ لوگ ہیں جن کا بیان استراقِ سمع سے زیادہ نہیں۔

(۲۴؍مئی ۱۹۱۳ء، وکیل، امرت سر)

نوٹ: یہ بات ہر حال میں لحاظ کے قابل ہے کہ ۹؍مارچ ۱۹۱۳ء کو ندوہ کا جو جلسۂ انتظامیہ اس معاملہ کے متعلق منعقد ہوا، اس میں مولانا شریک تھے اور اس جلسہ کی کارروائی چھپ کر شایع ہو چکی ہے، اس میں مولانا کی کوئی کارروائی درج نہیں، حالاں کہ وہ روداد میری طرف سے نہیں شایع ہوئی تھی بلکہ مولوی خلیل الرحمٰن کے دفتر سے شایع ہوئی، جو مولوی عبدالکریم صاحب کے سب سے بڑے حامی اور ان کے مربی ہیں۔ (شبلی)

تعلیقات و حواشی

مئی ۱۹۱۲ء میں روز روز کی ریشہ دوانیاں سے تنگ آ کر علامہ شبلی نے ماہنامہ الندوہ کی ادارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد ان کی جگہ پر مولوی عبدالکریم صاحب استاذ ندوہ کو ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے اپنی ادارت کے الندوہ کے پہلے ہی شمارہ میں جہاد پر ایک مضمون لکھا جو حکومت کی پالیسیوں کے خلاف تھا۔ اس پر تمام ارکان نے بالخصوص تمام معتمدین ندوہ نے متفقہ فیصلہ سے انہیں کچھ دن کے لئے برخواست کر دیا اور جب ان کے برخواست کرنے کی خبر باہر عوام میں پہونچی تو اس کی تمام تر ذمہ داری علامہ شبلی کے سر ڈال دی گئی اور بڑا ہنگامہ کیا گیا اور طرح طرح کے مضامین شائع کرائے گئے۔ علامہ شبلی

خاموش رہے مگر جب مولانا عبدالباری نے جو اس قضیہ میں شامل تھے، اپنی برأت شائع کرائی تو اس کے خلاف علامہ شبلی نے یہ مراسلہ لکھا اور اس فیصلہ کے سلسلہ میں ارکان نے جو کچھ کیا اور کہا تھا اس کی بھی تفصیل پیش کر دی۔ اس سے علامہ شبلی کے خلاف سازشوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۱) مولانا عبدالباری فرنگی محلی [۱۸۷۸-۱۹۲۶] ان علماء میں تھے جنہوں نے مسلمانوں کی بیداری کے لئے جدوجہد کی۔ وہ فرنگی محل میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم حاصل کی اور پھر وہیں درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ جنگ بلقان اور حادثہ مسجد کان پور نے انہیں بے حد متاثر کیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے بڑی جدوجہد کی۔ حرمین شریفین کے تحفظ کے لئے مسلمانوں بالخصوص علماء کو متوجہ کیا اور انجمن خدام کعبہ قائم کی اور اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس انجمن کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو بیدار کرنا اور انگریزوں کے خلاف ابھارنا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں انہوں نے گاندھی جی [۱۸۶۹-۱۹۴۸ء] جو تحریک خلافت کے ہم نوا تھے، سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر مختار انصاری، مشیر حسین قدوائی اور مولانا شوکت علی وغیرہ سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ تحریک خلافت کے بنیاد گزاروں میں ان کا بھی نام آتا ہے۔ علی برادران سے ارادت کا تعلق تھا۔ انہوں نے کم عمری میں وفات پائی۔ (یادرفتگاں، ص ۵۶-۵۹)

(۲) مسلم گزٹ لکھنؤ: اسے ۱۹۱۲ء میں میر سید جان نے جاری کیا۔ یہ اصلاً علامہ شبلی کی ایک کوشش تھی۔ سید میر جان نے اس شرط پر اسے جاری کیا تھا کہ علامہ شبلی اس کی ذمہ داری لے لیں چنانچہ علامہ شبلی نے یہ ذمہ داری قبول کی، مولوی وحید الدین سلیم کو ایڈیٹر مقرر کرایا، مضامین لکھے اور لکھوائے، اور اسے ایک مقبول اخبار بنا دیا۔

(۳) مولوی میر عبدالکریم [م: اپریل ۱۹۱۴ء] ضلع ہزارہ سرحد کے رہنے والے تھے۔ بڑے عالم وفاضل شخص تھے۔ ندوہ کے ممتاز اساتذہ میں تھے۔ علامہ شبلی نے جب ماہنامہ الندوہ کی ایڈیٹری سے استعفاء دیدیا تو یہ اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور پہلے ہی شمارے میں جہاد پر ایسا مضمون لکھ کر شائع کیا کہ ارباب ندوہ کو انہیں معطل کرنا پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماہنامہ الندوہ پھر سنبھل نہ سکا اور بند ہو گیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اسے دوبارہ جاری کیا مگر اس اشاعت ثانی کو بھی زندگی نہ مل سکی۔

مولوی عبدالکریم صاحب نے اپریل ۱۹۱۴ء میں لو لگنے سے لکھنو میں وفات پائی۔

(حیات شبلی، ص ۵۹۸)

---

[۱۸]

مولوی عبدالکریم صاحب کی معطّلی اور مولانا عبدالحی صاحب

جناب مولوی عبدالحی صاحب!

آپ نے مسلم گزٹ میں اس امر سے برأت ظاہر کی ہے کہ آپ مولوی عبدالکریم صاحب کی معطّلی میں شریک مشورہ نہ تھے۔

مولانا!

جو روداد جلسۂ انتظامیہ مورخہ ۹/مارچ ۱۹۱۳ء شایع ہوئی ہے، اس میں ریزولیوشن کی یہ عبارت ہے:

> ''اس جلسہ کے نزدیک مولوی عبدالکریم صاحب کا مضمون مسئلہ جہاد جو الندوہ بابت جون ۱۹۱۲ء میں شایع ہوا، اس کارروائی کا سزاوار نہ تھا، جو معتمد صاحب دارالعلوم نے بہ مشورہ مولوی عبدالحی صاحب و مولوی ظہور احمد صاحب کی اور یہ جلسہ یہ امر ضروری سمجھتا ہے کہ مولوی عبدالکریم صاحب سے یہ تینوں حضرات تحریری معافی مانگ کر جو نقصانات ان کو ان کی شہرت وغیرہ کے متعلق اس کارروائی سے پہنچے ہیں تلافی کریں۔''

اس تجویز کی تائید مولوی اعجاز علی صاحب (۱) نے کی، مولوی محمد نسیم صاحب (۲)

نے ترمیم کی کہ اس تجویز کا آخری حصہ جو معافی وتلافی کے متعلق ہے، اس کو نکال ڈالا جائے اس کی تائید مولوی عبدالباری صاحب نے کی اور باتفاق آرا ترمیم پاس ہوئی۔

یہ ریزولیوشن بہ ترمیم تحریک مقامی پاس ہوا۔ آپ بھی اس جلسہ میں موجود تھے۔ کیا جلسہ انتظامیہ کی یہ کارروائی، جس میں نہایت کثرت سے ممبر شریک تھے اور جو خود آپ کے زیر اہتمام شایع کی گئی ہے، غلط سمجھی جائے؟ اور کیا اس میں اتفاق آرا کا لفظ غلط ہے؟ اور مولوی عبدالباری صاحب نے اپنی شہادت میں یہ الفاظ بیان کیے ہیں:

''اس پر مولوی شبلی صاحب نے فرمایا کہ اچھا آپ (مولوی عبدالحی صاحب) معطّلی کا حکم لکھ دیں، مولوی عبدالحی صاحب نے منظور کیا۔''

کیا یہ الفاظ غلط ہیں؟

شبلی نعمانی

(۷؍جون ۱۹۱۳ء از وکیل، امرت سر)

تعلیقات و حواشی

مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے بعد مولوی عبدالکریم کی معطّلی کے سلسلہ میں مولانا سید عبدالحی حسنی نے بھی اخبار میں اپنی برأت کا اعلان فرمایا۔ علامہ شبلی نے یہ مراسلہ ان کی اعلان برأت کے سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے۔

(۱) مولوی اعجاز علی کاکوروی، رئیس کاکوری، ندوہ کے بڑے سرگرم رکن تھے۔

(۲) مولوی محمد نسیم [م: ۲۷؍اکتوبر ۱۹۵۳ء] گڑھی بھلول ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار اودھ کے ممتاز ترین وکلا میں ہوتا تھا۔ مولانا شاہ وارث حسن سے بیعت کا تعلق تھا۔ پیشہ وکالت کے باوجود مزاج دینی تھا۔ ندوہ سے بے حد تعلق رکھتے تھے اور اس کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ ان کے تین فرزند تھے:

۱۔محمد وسیم صاحب بیرسٹر، پاکستان کے پہلے ایڈوکیٹ جنرل

۲۔ پروفیسر محمد حبیب، سابق صدر شعبہ تاریخ وسیاسیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۳۔ پروفیسر محمد مجیب، سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حیات عبدالحی ،ص۲۰۳-۲۰۴بحوالہ تاریخ ندوۃ العلماء، ج۲،ص۴۸۹)

---

[۱۹]

مولوی عبدالکریم کی معطّلی

السلام علیکم۔(ایڈیٹر زمیندار لاہور)

میں دس دن سے سخت علیل ہوں اور صاحب فراش۔میرے متعلق آج کل جو اتہامات اور اکاذیب کا طوفان برپا کیا گیا ہے میں اس سے بے خبر نہیں ہوں،لیکن اول تو میری عام عادت ایسے موقعوں پر سکوت کی ہے،ثانیاً سخت بیماری کی وجہ سے میں کچھ نہ لکھ سکا۔مفصل بعد صحت لکھوں گا۔اس وقت مختصراً چند امور گذارش ہیں۔

۱۔میں نے اس وقت تک کوئی تحریر گورنمنٹ کے کسی افسر کو مولوی عبدالکریم صاحب کے متعلق خود نہیں بھیجی،نہ میں اس وقت تک کسی افسر سے اس معاملہ کے پیش آنے کے وقت سے اب تک ملا۔جو تحریریں گورنمنٹ میں گئی ہیں وہ دفتر نظامت سے گئی ہیں،جو میرے محکمہ سے بالاتر محکمہ ہے۔

۲۔جس جلسہ میں مولوی عبدالکریم صاحب کا تا جلسہ انتظامیہ معطل ہونا طے ہوا تھا اس میں پانچ حضرات شریک تھے،یعنی جناب مولوی عبدالباری صاحب فرنگی محلی، مولوی ظہور احمد صاحب (۱)،مولانا مولوی سید عبدالحی صاحب،منشی احتشام علی صاحب سکریٹری مال (۲)،اور خود میں۔اس جلسہ میں جو متفقہ انگریزی یادداشت مرتب ہوئی، مولوی ظہور احمد صاحب نے کی اور بذریعہ دفتر نظامت کے ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس بھیجی

گئی۔اس پر تینوں سکریٹری کے دستخط تھے یعنی مولانا سید عبدالحی صاحب، منشی احتشام علی صاحب اور خود میرے۔اردو تحریر میں اضافہ کے متعلق جو مجھ پر اعتراض ہے،اس کی بابت بعد کو لکھوں گا،اس وقت یہ عرض ہے کہ میں نے اپنی یاد سے اردو یادداشت میں جو لفظ اضافہ کیا وہ دفتر نظامت میں بھیج دیا گیا تھا اور وہ ایسا امر نہیں کہ اس پر واقعہ کا کوئی انحصار ہو۔

۳۔یہ امور کہ مضمون مذکورہ کا مقاصد ندوہ کے خلاف ہے اور اس کی اطلاع ڈپٹی کمشنر صاحب کو دینی چاہئے اور یہ کہ پرچہ (الندوہ) روک دیا جائے اور یہ کہ مولوی عبدالکریم صاحب ایڈیٹری سے معطل کئے جائیں،اس جلسہ کے تمام ارکان مذکورہ بالا کا متفقہ فیصلہ تھا۔میں نے کوئی مزید حصہ اس میں نہیں لیا۔یہ امر خود ان حضرات سے دریافت کرنا چاہئے۔البتہ جب اس جلسہ کے سب ارکان کی یہ رائیں قائم ہوچکیں کہ مضمون مقاصد ندوہ کے خلاف ہے تو میں نے اس بات پر زور دیا کہ جس طرح مولوی عبدالکریم صاحب کے متعلق یہ سب امور تا جلسہ انتظامیہ طے کئے جاتے ہیں اسی طرح جلسہ انتظامیہ کے منعقد ہونے تک وہ مدرسہ سے بھی معطل رہیں کیونکہ مدرسہ خاص میری ذمہ داری میں ہے۔

۴۔ندوۃ العلما کے اکیاون (۵۱) ممبر ہیں جن میں دوثلث علماء ہیں،ان کی کثرت آرا اب موصول ہوچکی ہیں۔

جن ارکان نے مضمون مذکورہ کو قابل گرفت خیال کیا اور اس بنا پر مولوی عبدالکریم صاحب کی معطّلی تا جلسہ انتظامیہ سے اتفاق کیا ان میں بعض حضرات یہ ہیں۔جناب حاجی نواب اسحاق خاں صاحب سکریٹری علی گڑھ کالج (۳)،جناب حاجی رحیم بخش صاحب پریزیڈنٹ بہاول پور (۴)،مولوی حبیب الرحمٰن صاحب شروانی رئیس علی گڑھ (۵)،جناب مولوی نظام الدین صاحب جعفری افسر واعظین مجلس ہدایت الاسلام دہلی (۶)،مولوی غلام محمد صاحب فاضل ہوشیارپوری (۷)،مولوی قاری عبدالسلام صاحب پانی پتی (۸)،امام

صاحب جامع مسجد دہلی (۹)، حکیم عبدالولی صاحب (۱۰)۔متعدد اراکین کی رائیں اس کے خلاف بھی ہیں لیکن کثرت آراء اسی طرف ہے۔

۵۔اس امر پر کہ اصل مضمون قابل گرفت ہے یا نہیں میں بعد صحت تفصیل سے لکھوں گا۔اس وقت صرف اس قدر گذارش ہے کہ مضمون مذکورہ دفعہ دس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی مسلمان کسی کافر کی حکومت میں نہیں رہ سکتا اگر رہے گا تو گنہ گار ہوگا۔

شبلی نعمانی

(زمیندار لاہور، ۱۰ جمادی الاولی ۱۳۳۱ھ)

تعلیقات وحواشی

مولوی عبدالکریم صاحب ایڈیٹر الندوہ جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے کی معطّلی متفقہ طور پر عمل میں آئی تھی اور یہ طے پایا کہ اس کی اطلاع حکومت کو بھیج دی جائے چنانچہ وہ دفتر نظامت یعنی مولانا سید عبدالحی صاحب کے دفتر سے بھیجی گئی اور الزام علامہ شبلی کے سر عائد کر دیا گیا۔ یہ مراسلہ اسی کی وضاحت میں لکھا گیا ہے۔

(۱) مولوی سید ظہور احمد وکیل لکھنؤ [م: ۲۷؍جون ۱۹۴۲ء] اصلاً الہ آباد کے رہنے والے تھے۔لکھنو میں وکالت کرتے تھے۔ان کا شمار لکھنو کے کامیاب وکلا میں ہوتا تھا۔مسلم لیگ کے سکریٹری بھی رہے۔ اکثر قومی کاموں میں شریک رہتے۔۱۹۰۵ء میں مجلس دارالعلوم ندوہ کے رکن منتخب ہوئے اور مدۃ العمر ندوہ کی خدمت میں مصروف رہے۔نیک طینت بزرگ تھے۔(تاریخ ندوۃ العلماء، ج ۲، ص ۴۸۸-۴۸۹)

(۲) منشی احتشام علی (۱۸۳۹-۱۹۴۳ء) رئیس کاکوری، تحریک ندوہ کے ابتدائی لوگوں میں سے تھے۔اس کے کاموں میں پیش پیش رہے۔ بڑے نیک، صالح، مخیّر اور فیاض شخص تھے۔مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی [۱۲۰۸-۱۳۱۳ھ] سے بیعت تھے۔تحریک ندوہ میں اشتراک کے سوا علامہ شبلی سے کسی تعلق کا ذکر نہیں ملتا۔ (یادرفتگاں، ص ۲۵۱)

(۳) نواب اسحاق خاں صاحب [۱۸۶۰-۱۹۱۷ء] سکریٹری علی گڑھ کالج: نواب اسحاق خاں سرفراز الملک نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کے پوتے تھے۔ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے، منتخب اساتذہ سے تعلیم پائی جس میں مولانا حالی جیسا عالی دماغ شخص بھی شامل ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آگرہ کالج میں داخل ہوئے اور درجہ اول میں انٹر پاس کیا۔ پھر سول سروس کے لئے منتخب ہوئے ترقی پاکر جج مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں حج و زیارت کر کے لوٹے تو نواب وقار الملک کی خواہش پر پنشن لے کر مدرستہ العلوم کے آنریری سکریٹری ہو گئے اور پھر اسی کی خدمت میں اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ ۱۹۱۷ء میں وفات پائی۔ دہلی میں دفن ہوئے۔ (مولانا انوار احمد زبیری، خطبات عالیہ، ص ۵۷-۵۹)

(۴) حاجی سر رحیم بخش [م: ۴؍مئی ۱۹۳۵ء] صدر بہاول پور، پنجاب قانون ساز کونسل کے رکن تھے۔ عرصہ تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ بعد ازاں نواب صاحب بہاول پور کی حکومت میں ملازمت کی اور ترقی کر کے وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز ہوئے اور بڑا اثر و رسوخ پیدا کیا۔ انہیں کی کوششوں سے ندوہ کو بہاول پور سے پچاس ہزار کی بڑی رقم ملی تھی جس کی خوشی میں علامہ شبلی نے ایک وقت کا کھانا فقراء میں تقسیم کرایا تھا۔ (یاد رفتگاں، ص ۱۵۴)

(۵) علامہ شبلی کے حبیب لبیب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۸۶۷-۱۹۵۰ء] رئیس حبیب گنج علی گڑھ، عالم و ادیب، شاعر اور انشا پرداز تھے۔ دسیوں کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ ان کے علمی و ادبی مقالات کا مجموعہ ''مقالات شروانی'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ فارسی کے پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ مجموعہ کلام ''کاروان حسرت'' شائع ہو چکا ہے۔ برسوں ریاست حیدر آباد میں وزیر محکمہ امور مذہبی رہے۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے پہلے وائس چانسلر ہونے کا فخر انہیں کو ملا۔ تحریک ندوہ میں پیش پیش رہے اور اس کی بڑی خدمت انجام دی۔ دار المصنّفین کے بھی تا حیات صدر رہے اور اس کو ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ علامہ شبلی سے بے پناہ تعلق تھا، شبلی نے خود ہی انہیں حبیب شبلی کا خطاب دیا تھا۔
(تفصیل کے لئے دیکھیں صدر یار جنگ از ڈاکٹر شمس تبریز خاں)

(۶) مولوی نظام الدین جعفری افسر واعظین مجلس ہدایت الاسلام دہلی

(۷) مولوی غلام محمد صاحب ہوشیار پوری نور محل ضلع جالندھر کے رہنے والے، ندوہ کے رکن اور بڑے بہی خواہ تھے۔ (حیات شبلی،ص ۴۴۶)

(۸) مولوی قاری عبدالسلام صاحب پانی پتی [م: ۵/اکتوبر ۱۹۱۸ء] قاری عبدالرحمٰن پانی پتی کے منجھلے صاحبزادے تھے۔ والد ہی سے علوم دینیہ کی تحصیل وتکمیل کی۔ عمر بھر درس قرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ فن قرأت میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ندوہ کے رکن تھے اور اس کے کاموں میں بڑی دلجمعی سے لگے رہتے تھے۔ (تذکرہ رحمانیہ،ص ۷۴-۷۵)

(۹) امام جامع مسجد دہلی: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۱۰) حکیم عبدالولی [۱۸۸۴-۱۹۴۱ء] اطبائے لکھنو [جھوائی ٹولہ] کے ایک ممتاز فرد اور بڑے بااثر شخص تھے۔ ایم اے او کالج علی گڑھ سے بی، اے اور خانوادے کے اطباء سے طب وحکمت کی تعلیم حاصل کی۔ کلکتہ مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر ہوئے لیکن پرنسپل سر ڈینیسن راس (Sir Denson Rass) سے تکرار کے سبب مستعفی ہوکر بارہ بنکی چلے آئے۔ یہاں چار برس میونسپل بورڈ کے سکریٹری اور بارہ سال منتخب چیرمین رہے۔ تحریک خلافت اور ترک موالات وغیرہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، گرفتار ہوئے اور ایک سال سے زاید جیل میں رہے۔ رہائی کے بعد پنڈت موتی لعل نہرو کی سوراج پارٹی سے لکھنؤ میونسپلٹی کے انتخاب میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ ان کے مدمقابل خان بہادر سید احمد حسن رضوی تھے۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، پنڈت جواہر لعل نہرو، چودھری خلیق الزماں، سید وزیر حسن اور پنڈت گووند ولبھ پنتھ وغیرہ ان کے بے تکلف احباب میں تھے۔

سیاست کے ساتھ علم وادب سے بھی گہرا شغف رہا۔ جمیلہ کی ناکامی، زندگی کے مزے اور لامذہب مسلمان ان کی قلمی یادگاریں ہیں۔ انہوں نے لکھنؤ جھوائی ٹولہ سے ایک رسالہ ''معلومات'' بھی جاری کیا تھا۔ [تذکرہ خاندان عزیزیہ ص ۱۲۷]

[۲۰]

اوقاف اسلامی

آپ اس بات سے واقف ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی اور تمدنی ضروریات روز بروز بڑھتی جاتی ہیں، جس کے لیے مصارف کثیر درکار ہوتے ہیں اور اس وجہ سے ہر روز ایک نیا چندہ کھولنا پڑتا ہے، لیکن اس غریب قوم کی یہ حالت نہیں کہ ان تمام چندوں کی متحمل ہو سکے۔ اس لیے اکثر کام ناتمام رہ جاتے ہیں اور قومی ضرورتوں کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔

اس کی سب سے بہتر اور آسان تدبیر یہ تھی کہ ملک میں کروڑوں روپئے کے جو اسلامی اوقاف ہیں ان کا ایسا معقول انتظام ہوتا کہ وہ بیجا مصارف میں نہ صرف ہوتے اور صحیح ضروریات کے کام میں آتے۔ اسی ضرورت سے مسلم لیگ اور دیگر اسلامی انجمنوں نے بار بار یہ رزولیوشن پاس کیا کہ گورنمنٹ ان اوقاف کی نگرانی پر متوجہ ہو، لیکن گورنمنٹ سے یہ جواب ملا کہ دو باتیں ثابت کرنی چاہئیں؛ ایک یہ کہ یہ خواہش تمام قوم کی طرف سے ہے، دوسرے یہ کہ وہ اوقاف صحیح مصرف میں نہیں صرف کیے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد مسلم لیگ یا اور کسی انجمن نے کچھ کارروائی نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کہہ دینا نہایت آسان ہے کہ اوقاف کا انتظام کیا جائے۔ لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ کون کرے اور کس طرح کیا جائے۔ گورنمنٹ تو اس لیے دست اندازی نہیں کر سکتی کہ وقف عموماً ایک مذہبی چیز ہے اور گورنمنٹ کسی مذہبی چیز میں ہاتھ ڈالنے سے ہمیشہ محترز رہتی ہے اور اس کو محترز رہنا چاہیے۔ قوم میں کوئی شخص یا چند اشخاص متوجہ ہوں تو وہ کیا کر سکتے ہیں۔ متولیان اوقاف پر کوئی اختیار حاصل

نہیں، عدالت میں اگر مقدمات دائر کیے جائیں تو اس طول عمل اور دردسری اور سب سے بڑھ کر مصارف کا کون متکفل ہوسکتا ہے۔

اس بنا پر میں چاہتا ہوں کہ ایک مختصر سی کمیٹی قایم ہو جو اس کی تدبیروں پر غور کرے اور کوئی صحیح اور متعین اور قابل عمل طریقہ تجویز کر کے ایک اسکیم (خاکہ) بنائے جو قوم کے سامنے پیش کی جائے اور فیصلہ کے بعد اس پر عمل کیا جائے۔ اس بنا پر میں آپ سے خواہش کرتا ہوں کہ آپ اس کی ممبری قبول فرمائیں۔

چند سرسری باتیں میں بہ دفعات ذیل پیش کرتا ہوں۔

۱- ایک موریل تیار کیا جائے جس میں انتظام اوقاف کی خواہش گورنمنٹ سے کی جائے اور اس موریل پر اس کثرت سے مسلمانوں کے ہر طبقہ سے دستخط کرائے جائیں کہ یہ موریل تمام قوم کی طرف سے سمجھا جائے۔

۲- گورنمنٹ سے جس قسم کی نگرانی کی خواہش کی جائے، اس طریقے کی ہو کہ مذہبی دست اندازی کا کسی طرح احتمال پیدا نہ ہونے پائے مثلاً اس کا یہ طریقہ ہو کہ ایک کمیٹی قایم کی جائے جس کے ارکان تمام صوبوں سے نیابتانہ طریقے پر انتخاب کیے جائیں اور انتخاب کی تمام کارروائی صرف اسلامی جماعت کی طرف سے انجام پائے۔ پھر گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کمیٹی کو باقاعدہ تسلیم کرے اور اس کو باضابطہ اختیارات تحقیقات وغیرہ کے دئے جائیں۔ پھر اس کی مرتب کردہ رپورٹ ملک میں شایع کی جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

۳- تیموری سلطنت میں تمام اوقاف کے انتظام کا ایک خاص عہدہ تھا، جس کو صدر الصدور کہتے تھے۔ کیا گورنمنٹ سے یہ درخواست نہیں کی جاسکتی کہ یہ عہدہ دوبارہ پھر قایم کیا جائے۔ لیکن صدر الصدور کا تقرر اسی نیابتانہ اصول پر اسلامی جماعت کی طرف سے ہو، تاکہ گورنمنٹ کے متعلق کسی قسم کی دست اندازی کا احتمال نہ پیدا ہوسکے۔ ان کے علاوہ

اور جو تجویزیں آپ کے خیال میں آئیں آپ تجویز فرمائیں۔

(تاریخ ۲۶ر جنوری ۱۹۱۴ء، مطبوعہ)

تعلیقات و حواشی

تحریک وقف علی الاولاد کی کامیابی کے بعد علامہ شبلی کو عام اوقاف اسلامی کے تحفظ کا خیال پیدا ہوا چنانچہ جنوری ۱۹۱۴ء میں وفات سے ۱۱ر ماہ پہلے تمام برادران اسلام کی خدمت میں ایک مراسلہ لکھا۔ زیر نظر مراسلہ دراصل وہی تحریر ہے۔ اس میں انہوں نے اوقاف اسلامی کی اہمیت کے ذکر کے ساتھ اس کی بربادی پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور اس کے تحفظ کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کیا ہے۔ چنانچہ گورنمنٹ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور کارروائی کا آغاز کیا۔ اس تحریک کو انہوں نے کس جذبہ کے ساتھ شروع کیا تھا ان کے درج ذیل اقتباس سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

ع انچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

آپ نے دیکھا ادھر اوقاف اسلامی کی تحریک شروع ہوئی ادھر گورنمنٹ نے یادداشت شائع کی اور ایک کانفرنس اسی ماہ میں بٹھانے والی ہے۔ خیر میرا کام تو اس کے پیچھے جان لڑا دینا ہے ؎

آگے نصیب ہے جسے پروردگار دے

لیکن افسوس چند ماہ بعد مولانا شبلی نے انتقال کیا۔ تاہم اس تحریک کے بھی دوررس نتائج برآمد ہوئے اور عام اوقاف اسلامی کی طرف خاطر خواہ توجہ دی گئی۔

---

[۲۱]

ایک اہم تجویز دار المصنّفین

خدا کا شکر ہے کہ ملک میں تصنیف و تالیف کا مذاق پھیلتا جاتا ہے اور قابل قدر ارباب قلم پیدا ہوتے جاتے ہیں، لیکن بایں ہمہ اس گروہ میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو مصنف کے بجائے مضمون نگار یا انشا پرداز کہنا زیادہ موزوں ہوگا کیوں کہ ان کی مستقل تصنیفیں نہیں ہیں بلکہ معمولی رسالے یا مضامین ہیں۔

اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کو اعلیٰ درجہ کی تصنیف کی قابلیت نہیں۔ بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تصنیف کے لیے جو سامان درکار ہے وہ مہیا نہیں ہے۔ ان میں سے اکثر کے پاس کتابوں کا ذخیرہ نہیں جو انتخاب اور استنباط اور اقتباس کے کام آئے۔ اتفاق سے اگر کوئی مقامی کتب خانہ موجود ہے تو دلجمعی کے اسباب نہیں کہ اطمینان سے چند روز وہاں رہ کر کتابوں کا مطالعہ اور اس سے استفادہ اور نقل و انتخاب کر سکیں۔ ان باتوں کے ساتھ کوئی علمی مجمع بھی نہیں کہ ایک دوسرے سے مشورہ اور مبادلہ خیالات ہو سکے۔

ان مشکلات کے حل اور تصنیف و تالیف کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ایک وسیع ''دار التصنیف'' امور ذیل کے موافق قایم کیا جائے۔

۱- ایک عمدہ عمارت ''دار التصنیف'' کے نام سے قایم کی جائے جس میں ایک وسیع ہال کتب خانہ کے لیے ہو اور جس کے حوالی میں ان لوگوں کے قیام کے لیے کمرے ہوں جو یہاں رہ کر کتب خانہ سے فائدہ اٹھانا اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہنا چاہتے ہوں۔

۲- یہ کمرے خوبصورت اور خوش وضع ہوں اور ان مشہور مصنفین کے نام سے موسوم ہوں جو تصنیف کی کسی خاص شاخ کے موجد اور بانی فن ہوں۔

۳- ایک عمدہ کتب خانہ فراہم کیا جائے جس میں کثرت تعداد ہی پر نظر نہ ہو بلکہ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جس فن کی کتاب ہو، نادر اور کمیاب ہو۔

۴- تصنیفی وظائف قایم کیے جائیں اور وظیفہ عطا کنندہ کے نام سے موسوم کیا جائے۔ یہ وظائف یا ماہوار ہوں گے یا کسی تصنیف و تالیف کے صلہ کے طور پر دے جائیں گے۔

۵- جو لوگ کم از کم پانچ سو روپیہ یک مشت عطا فرمائیں گے ان کے نام اس عمارت پر کندہ کیے جائیں گے۔ میں یہ تجویز بالکل ایک سرسری صورت میں پیش کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ سر دست محض ایک خاکہ کے طور پر اس کی بنیاد قایم ہو جائے جو رفتہ رفتہ خود بہ خود وسعت حاصل کرتی جائے گی۔ اس بات کا مجھ کو اطمینان ہے کہ ریاست ہائے اسلامی سے اس کے لیے ماہوار مقرر ہو سکیں گی۔ سر دست ہم کو صرف دس ہزار روپیہ درکار ہے جس سے ایک مختصر تعمیر کی بنیاد ڈال دی جائے اصل فنڈ کے لیے پچاس ہزار روپیہ کا تخمینہ کیا گیا ہے۔

۶- دس ہزار کی رقم میں میں سر دست ایک ہزار اپنا پیش کرتا ہوں اور میں اس بات کا بھی مستدعی ہوں کہ جن بزرگوں کو میری تجویز سے دلچسپی ہو، مجھ سے خط و کتابت فرمائیں اور مناسب مشورہ سے میری ہمت افزائی کریں، نیز ایڈیٹران ہمدرد، وطن، پیسہ اخبار، مشرق، البشیر، وکیل وغیرہ سے درخواست ہے کہ اس تجویز کو اپنے اپنے اخبار میں شایع فرمائیں۔ فقط

شبلی نعمانی

(الہلال، ۱۱رفروری ۱۹۱۴ء)

تعلیقات و حواشی

یہ مراسلہ دراصل دارالمصنّفین کا اعلان تاسیس ہے۔ اس کا خاکہ علامہ شبلی کے ذہن میں برسوں پہلے سے تھا اور وہ اسے ندوہ میں قائم کرنا چاہتے تھے مگر حالات سازگار نہیں ہوئے اور انہیں ندوہ سے مستعفی ہونے کے بعد اپنے وطن اعظم گڑھ میں قائم کرنا پڑا۔ اب دارالمصنّفین کے قیام کو سو برس ہو چکے ہیں۔ اس کی سوسالہ شاندار تاریخ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ عالم اسلام کا ایک ممتاز علمی، تحقیقی اور تصنیفی ادارہ ہے۔ اس کی تاریخ پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان میں دارالمصنّفین کی تاریخ اور علمی خدمات از پروفیسر خورشید نعمانی (مطبوعہ دارالمصنّفین)، دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات از محمد الیاس الاعظمی (مطبوعہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ)، اور دارالمصنّفین کے سوسال از مولانا کلیم صفات اصلاحی (مطبوعہ دارالمصنّفین) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

---

[۲۲]

ایک مذہبی مدرسۂ اعظم کی عمارت کے لیے
تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے درخواست

تمام ہندوستان میں ایک بھی ایسا خالص دینی اور مذہبی مدرسہ نہیں جو بلحاظ جامعیت ووسعت کے مدرسہ اعظم کہلانے کا مستحق ہو یعنی:

جس میں تمام علوم دینیہ یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، اصول کی تعلیم ایسے کمال کے درجہ تک دی جاتی ہو کہ تحقیق کا مرتبہ حاصل ہو سکے۔

جس میں اسلامی علوم کی تمام قدیم اور نادر کمیاب کتابیں فراہم کی گئی ہوں۔

جس میں طالب علموں کو تصنیف وتالیف کی تعلیم دی جاتی ہو۔

جس میں ایسے لوگ تیار کیے جاتے ہوں جو مخالفین مذہب کے اعتراضات کا جواب آج کل کے مذاق کے موافق دے سکیں۔

جس میں حکومت موجودہ کی زبان بھی بقدر ضرورت پڑھائی جاتی ہو۔

جس کی عمارت وسیع، پرفضا اور عظیم الشان ہو۔

ہندوستان میں چھ کروڑ مسلمان ہیں، ان کی سینکڑوں دنیوی تعلیم گاہیں ہیں، سینکڑوں چھوٹے چھوٹے مدرسے ہیں لیکن ایک بھی مذہبی مدرسہ اعظم نہیں ہے۔ یہ کس قدر افسوس اور شرم کی بات ہے۔

اس غرض کے پورا کرنے کے لیے لکھنؤ میں ندوہ کا دارالعلوم قایم کیا گیا اور اگرچہ ابھی اس کا محض خاکہ تیار ہوا ہے لیکن جو ضرورتیں اوپر بیان کی گئیں، ان سب کی داغ بیل ڈال دی گئی ہے۔ تمام مذہبی اور عربی علوم کی تعلیم ہوتی ہے، عربی زبان دانی اس درجہ تک سکھائی جاتی ہے کہ طلبہ برجستہ بڑے بڑے جلسوں میں عربی زبان میں لکچر دے سکتے ہیں۔ تصنیف وتالیف کی مشق کرائی جاتی ہے جس کا اندازہ طلبہ کے لکھے ہوئے مضامین سے ہوسکتا ہے، جو الندوہ میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔

علوم جدیدہ اور حکومت موجودہ کی زبان بھی بقدر ضرورت سکھائی جاتی ہے۔

یہ تمام امور ابھی ابتدائی پیمانے پر ہیں اور کوشش ہے کہ اعلیٰ درجہ کی حد تک پہنچ جائیں لیکن نہایت افسوس ہے کہ عمارت نہایت پست حالت میں ہے، رفعت اور عظمت ایک طرف طالب علموں کے رہنے کی بھی گنجایش نہیں۔

عمارت کا جو نقشہ تجویز کیا گیا ہے، اس کی یہ قطع ہے کہ چاروں طرف طالب العلموں کے رہنے کے مکانات، بیچ میں مدرسہ کی عمارت اور ایک طرف عظیم الشان مسجد ہوگی۔

تمام علوم کے درس کے لیے الگ الگ کمرے ہوں گے یعنی تفسیر کے لیے جدا، حدیث کے لیے جدا، فقہ کے لیے جدا، ادب کے لیے جدا اور علیٰ ہذا القیاس۔ یہ کمرے ان ہی علوم کے نام سے موسوم ہوں گے مثلاً دار التفسیر، دار الحدیث، دار الفقہ وغیرہ وغیرہ۔

جو رئیس یا امیر جس کمرے کی تعمیر اپنے صرف سے کرائیں گے، اس کمرے کی پیشانی پر ان کا نام کندہ ہوگا اور اس طرح ابدالابد تک یہ خیر جاری ان کے نام سے قایم رہے گی۔ جو کمرہ عام چندہ سے تیار ہوگا ان پر ان اشخاص کے نام کندہ کیے جائیں گے جو کم از کم سو روپیہ عطیہ دیں گے۔

چوں کہ یہ عمارت ایک عظیم الشان عمارت ہوگی جس کا تخمینہ (مسجد کے علاوہ) پچاس ہزار سے کم نہیں ہوسکتا، اس لیے ندوہ کی طرف سے ہم چند ارکان نے ارادہ کیا ہے کہ

مشہور مقامات میں دورہ کر کے اس رقم کو فراہم کریں۔ امید ہے کہ بزرگان قوم ہماری اور اپنی شرم رکھیں گے اور ایک خالص مذہبی کام کے انجام دینے میں ہم کو مایوس نہ کریں گے۔

(ماہنامہ الندوہ لکھنؤ دسمبر ۱۹۰۴ء)

تعلیقات و حواشی

علامہ شبلی ندوہ کو مدرسہ اعظم بنانا چاہتے تھے۔ ان کی نظر میں مدرسہ اعظم کی جو خصوصیات ہو سکتی ہیں زیر نظر مراسلہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ مراسلہ دراصل ندوہ کی عمارت کی تعمیر کے لئے چندہ کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے۔ یہی اپیل تھی کہ جس نے حضرت نواب صاحب بہاول پور کو پچاس ہزار روپے دینے کا داعیہ پیدا کیا اور ندوہ کی تعمیرات کا کام جاری ہوا۔

علامہ شبلی کو مدرسہ اعظم سے جو توقعات وابستہ تھیں وہ مخالفین کی وجہ سے پوری نہ ہو سکیں۔

[۲۳]

اسٹرایک کا سبب کون تھا؟

اسکندریہ کا کتب خانہ قدیم جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے قایم ہوا تھا، عیسائیوں نے عہد ظلمت میں برباد کردیا،لیکن جب اس بدنامی کا احساس ہوا تو اس الزام سے بچنے کا سب سے بڑا حیلہ جو انھوں نے ایجاد کیا وہ اس الزام کا مسلمانوں کے سر منڈھ دینا تھا، چناں چہ ایک مدت تک تمام یورپ میں یہ اتہام اور افترا صدائے حق بن کر گونجا کیا۔

اسٹرایک کی تحقیق کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے طلبہ کا خود اظہار لیا جاتا، پھر مدرسین کی شہادت لی جاتی، جو ہر حیثیت سے اعتبار کے قابل تھی۔طلبہ نے مدرسین کو عرض حال میں اپنا فریق بنالیا ہے۔ مدرسین کی ایک کافی جماعت ہے، ان میں متعدد ایسے ہیں جن کا صدق اور راستی بےلوث ہونے پر خود مخالف پارٹی کو بھی اتفاق ہے۔اس بنا پر ان کا بیان ہر طرح پر طلبہ کی جانب داری سے آزاد ہوتا۔اس کے ساتھ ان شکایتوں کی تحقیق کی جاتی جو طلبہ نے پیش کیں جن سے اندازہ ہوسکتا کہ وہ اسٹرایک کا سبب ہوسکتی ہیں یا نہیں؟

لیکن ان سب کے بجائے صرف یہ کیا گیا کہ دو خط پیش کیے گئے، جن سے یہ ثابت کیا گیا کہ اسٹرایک کا محرک اور بانی فلاں شخص یعنی ''میں'' تھا۔

پہلا خط عبدالسلام (۱) کا ہے جو ایک فارغ التحصیل طالب العلم کے نام ہے۔ اس خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ خط ''میرے'' ایما سے لکھا گیا،۔بے شبہ یہ خط نہایت بے ہودہ، سفیہانہ، بلکہ مجنونانہ ہے۔ میں نے اصل خط اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے لیکن بہر

نوع جس کا خط ہو، میں صرف یہ کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ اگر یہ خط میرے ایما سے لکھا گیا یا اب بھی میں اس کو جائز سمجھتا ہوں تو میں دائرۂ اسلام سے خارج ہوں۔لعنة الله علی الکاذبین

دوسرا خط خاص میرا ہے اور بے شبہ مجھ کو تسلیم ہے کہ وہ میرا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کو اسٹرائیک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چناں چہ وہ خط و دفتر نظامت نے روداد میں شایع کر دیا ہے۔ اس کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس میں ندوہ کے اصلاح کے طریقۂ عمل کے سوا اور کچھ نہیں۔ بے شبہ یہ میرا خط، میری رائے اور میری استدعا ہے لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس خط کو اسٹرائیک سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اسٹرائیک کا اصل سبب دریافت کرنا ہو تو ندوہ کے موجودہ دور کے سلسلۂ واقعات کو پیش نظر رکھئے۔ دارالعلوم کے طلبہ میں سے ایک ایک بچہ جانتا اور سمجھتا ہے کہ وہ قدیم عربی مدارس اور کسی انگریزی اسکول کو چھوڑ کر ندوہ میں کیوں پڑھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ ندوہ کا نصب العین دونوں سے کوئی الگ چیز یا دونوں کا مجموعہ ہے۔ طلبہ اس طرز تعلیم اور ان خیالات کے مدت سے عادی ہو چکے تھے جن صاحب کے ہاتھ میں اب ندوے کی باگ ہے، طلبہ ایک مدت سے ان کے مبلغ علم، ان کے اشغال، ان کے مزاج، ان کے انداز طبیعت سے واقف تھے۔ طلبہ یہ بھی جانتے تھے کہ مجلس انتظامی خود کوئی چیز نہیں، نیا ناظم جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔ ایسی حالت میں انھوں نے دیکھا کہ دفعۃً ان کی قسمت کس شخص کے ہاتھ میں آ گئی ہے لیکن انتظامی امور میں کچھ دخل دینا ان کے منصب سے بالاتر تھا۔ اس لیے انھوں نے خاموشی کے ساتھ گوارا کیا لیکن چند ہی روز کے بعد انھوں نے دیکھا کہ طرز تعلیم بالکل بدل گیا ہے، عربی تقریر کرنے کی مشق، مسائل علمی پر خطبہ دینا، جدید زبان عربی کے وسائل تحصیل، فن تفسیر کے ساتھ خاص اعتنا، یہ سب مفقود ہو گیا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ پرنسپل کے اختیارات بالکل فنا ہو گئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ''مجلس دارالعلوم''، جو تعلیمی نصاب کی ذمہ دار ہے اور وہی ہر قسم کے تعلیمی انتظامات کا حق رکھتی ہے، اس کا اجلاس بھی آج تک نہ ہوا، بلکہ صرف ایک ذات

واحد خودمختارانہ ندوہ کے تعلیمی اوراق الٹ پلٹ رہی ہے۔

یہ خودمختاری اس حد تک پہنچی کہ بخاری شریف کا سبق جو طلبہ مدرسہ سے باہر پڑھتے تھے روک دیا گیا۔ یہ حکم اس قدر ناموزوں تھا کہ جب پرنسپل صاحب سے اس کی تعمیل کرانے کے لیے کہا گیا تو وہ کئی دن تک لیت ولعل کرتے رہے اور خود مجھ سے آ کر کہا کہ میں کیا کروں۔ مجھ کو یہ حکم دیا جاتا ہے، میں نے کہا کہ آپ ناظم صاحب سے تحریری حکم لکھوا لیجیے اور اس کی تعمیل کیجیے، لیکن حکم دینے والا اس حکم کی ناموزونی کا خود دل میں احساس کرتا تھا، اس لیے پرنسپل صاحب سے کہا گیا کہ آپ خود تحریری حکم دے دیں۔ مجبور ہو کر انھوں نے تحریری حکم دیا۔ چوں کہ بخاری شریف کا سبق ''میں'' پڑھاتا تھا اور خاص میرے نام سے حکم دینا مصلحت کے خلاف تھا، اس لیے یہ حکم اس صورت میں دیا گیا کہ طلبہ کوئی سبق کسی سے خارج از مدرسہ نہ پڑھنے پائیں۔ بہت سے طلبہ ایسے تھے جو باہر کے استادوں سے اپنی ناغہ شدہ کتابیں پڑھتے تھے، بہت سے ایسے تھے جو اپنی صف میں کمزور ہونے کی وجہ سے باہر کے اساتذہ سے سبق کا اعادہ کرتے تھے، اس امتناعی حکم نے دفعۃً طلبہ کے ایک گروہ کثیر کو تحصیل علم سے محروم کر دیا۔ طلبہ کے سامنے اب یہ مناظر پیش نظر ہیں، بخاری کا مقدس درس صرف ایک شخص کی ضد سے روک دیا گیا ہے، طلبہ تمام بیرونی اسباق سے روک دئے گئے ہیں اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو طلبہ بخاری شریف پڑھنے جاتے ہیں، ان کا نام مدرسہ سے خارج کر دیا جائے۔ طلبہ عاجزانہ درخواستیں دے رہے ہیں اور کچھ شنوائی نہیں ہوتی۔ طلبہ مقامی ارکان کے پاس جاتے ہیں اور ہر جگہ سے صدائے ''دور باش'' آتی ہے۔

عین اسی حالت میں مولود شریف کا زمانہ آیا اور طلبہ نے جیسا کہ ہمیشہ سے معمول تھا، مولود شریف کرنا چاہا لیکن اس خیال سے کہ مولود شریف ''میں'' بیان کروں گا، وہ مولود سے روکے گئے اور تین دن تک یہ مرحلہ رہا۔ آخر لوگوں نے سمجھایا کہ مولود کے روکنے سے شہر میں عام برہمی پھیلے گی، مجبوراً چند شرطوں اور قیدوں کے ساتھ مولود کی منظوری دی گئی۔ اس کے

بعد اور واقعات پیش آئے، جو اخبارات میں آ چکے ہیں، کیا یہ تمام واقعات اس بات کے لیے کافی نہیں کہ طلبہ ایسے جابرانہ احکام گوارا نہ کرسکیں۔ میں ایماناً کہتا ہوں کہ میں نے طلبہ کو اسٹرایک سے روکا، بخاری شریف کا جب سبق بند کیا گیا تو عبدالخالق ایک طالب علم میرے پاس روتا ہوا آیا اور نہایت دردناک الفاظ میں بولا کہ اب پانی سر سے گذر چکا لیکن میں نے ان کو سمجھایا کہ صبر و تحمل سے کام لو اور اس قسم کی باتیں نہ کرو۔ عبدالسلام کا خط بعض اخباروں میں چھپ چکا تھا اور میں اس سے واقف ہو چکا تھا۔ ایک اور طالب العلم کو بھی میں نے سمجھایا کہ تم اسٹرایک کا ہرگز خیال نہ کرو۔ ورنہ میری نسبت سوئے ظن پیدا ہوگا۔ وہ اس وقت خاموش ہو گیا، دوبارہ مولود کے واقعہ کے وقت آیا اور پھر میں نے اس کو سمجھایا، اس نے کہا کہ ''ہم آپ کی بدنامی کے ڈر کے مارے کب تک اپنے مذہب اور دین کی توہین گوارا کریں گے۔''

اب ان واقعات پر غور کیجیے کہ ندوہ کے طلبہ دولت مند اور خوش حال نہیں ہیں، ۲۰-۲۲ لڑکے بالکل نادار ہیں، جو ندوہ سے وظیفہ پا کر بسر کرتے ہیں۔ باقی ایسے ہیں کہ بہ مشکل چھ روپیہ مہینہ کھانے کی قیمتیں ادا کرتے ہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ اسٹرایک کے ساتھ وہ دفعتہً مالی مدد اور ہر قسم کے آرام سے محروم ہو جائیں گے، نادار طلبہ کا کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا، تعلیم و تعلم کا سلسلہ بالکل بند ہو جائے گا، شہر میں ان کا کوئی خبر گیراں اور حامی نہیں، اس حالت میں کیا صرف عبدالسلام کا خط یا میری کشمکش ان کو ایسی حیرت انگیز خودکشی پر آمادہ کرسکتی تھی؟ پھر یہ خودکشی ایک دو دن نہ تھی، بلکہ پورا ایک مہینہ ہو چکا ہے اور اب تک قایم ہے۔

زمانہ میں طلب حقوق کی جو عام ہوا چل رہی ہے، اسٹرایک کے عظیم الشان واقعات جو علی گڑھ، آگرہ، لکھنؤ، لاہور میں پیش آ چکے ہیں اور آزادی کا جو مذاق عام ہو رہا ہے، صحیح ہو یا غلط، لیکن کیا اس سے کسی درس گاہ کے طلبہ بے اثر رہ سکتے ہیں؟ آپ جس کو اسٹرایک کہتے ہیں وہی چیز دوسروں کی نظر میں حقوق طلبی کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

تاریخوں میں یہ پڑھ کر کہ فاروق اعظم کو عین منبر پر ایک شخص نے جواب دیا تھا کہ اگر تم ٹیڑھے چلو گے، تو تلوار سے تمہارا بل نکال دوں گا، کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ یہ اسٹرایک یا بغاوت تھی، بلکہ یہ آزادانہ فقرے اسلام کی تاریخ کے طغرائے امتیاز ہیں۔ ان حالات کے ساتھ بخاری شریف کے درس اور مولود کے روکنے پر اسٹرایک کر دینا کون سی تعجب کی بات ہوسکتی ہے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں ندوہ میں جو قیامت انگیز اور شرم ناک بدعملیاں ہو رہی ہیں، ان پر صرف عبدالسلام کے خط کا پردہ ڈال دیا جاسکتا ہے اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے نظر سے اوجھل ہو جائیں گی۔

(ہمدرد، دہلی ۶/اپریل ۱۹۱۴ء)

تعلیقات و حواشی

ندوہ میں جو تاریخی اسٹرائک ہوئی تھی جس کی تمام تر ذمہ داری علامہ شبلی کے سر منڈھ دی گئی تھی، علامہ شبلی نے زیرِ نظر مراسلہ میں اس کے اسباب بیان کئے ہیں اور واضح کیا ہے کہ طلبہ کے ساتھ زیادتیاں ہوئیں، اس لئے ندوہ میں اسٹرائک ہوئی۔ یہ اسٹرائک تقریباً ڈھائی ماہ جاری رہی اس کے روحِ رواں مولانا مسعود علی ندوی تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کی کوششوں سے یہ اسٹرائک ختم ہوئی۔

(۱) مولانا عبدالسلام ندوی [۱۸۸۲-۱۹۵۶] اردو کے نامور ادیب وانشا پرداز اور مصنف تھے۔ اعظم گڑھ کے ایک موضع علاء الدین پٹی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے خسر مولوی عبداللہ چاند پاروی سے حاصل کی۔ کان پور اور آگرہ میں تحصیل علم کے بعد ندوہ پہونچے اور وہیں تکمیل کی۔ پہلے ماہنامہ الندوہ کے نائب مدیر رہے پھر الہلال کلکتہ کی ادارت سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۱۴ء میں دارالمصنّفین قائم ہوا تو اس سے وابستہ ہو گئے پھر مدۃ العمر کسی اور طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ وہ علامہ شبلی کے خاص شاگردوں میں تھے۔ بلکہ انہیں جن لوگوں پر ناز تھا ان میں ایک مولانا عبدالسلام ندوی بھی تھے۔ مولانا عبدالسلام ندوی اردو کے ایک بڑے مصنف تھے۔ علم وادب کے مختلف موضوعات پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں سپردِ قلم

کیں۔ان میں اسوۂ صحابہؓ وصحابیاتؓ،امام رازی،ابن خلدون،اقبال کامل،فقرائے اسلام،تاریخ الحرمین الشریفین،شعرالہند،حکمائے اسلام، تاریخ فقہ اسلامی،سیرت عمر بن عبدالعزیز وغیرہ بے حد اہم کتابیں ہیں۔وہ شاعر بھی تھے اور شمیم تخلص کرتے تھے۔دارالمصنّفین ہی میں وفات پائی اور اسی کے احاطہ میں مدفون ہیں۔(تفصیل کے لئے دیکھیں یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی از محمد الیاس الاعظمی)

[۲۴]

اصلاح ندوہ اور ہمدرد

بخدمت اڈیٹر صاحب ''ہمدرد'' دہلی۔

''ہمدرد'' کے پرچہ مورخہ ۲۴/اپریل ۱۹۱۴ء میں جو آرٹیکل ''اصلاح ندوہ'' کے نام سے نکلا ہے، اس کے اعتدال اور میانہ روی اور نیک نیتی کا مجھ کو دل سے اعتراف کرنا چاہیے۔ اڈیٹر صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ ''اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر نہ رہیں گے، اگر ہم یہ کہیں کہ ندوہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر ان تمام عظیم الشان مقاصد کو خاک میں ملا دیا جائے، جس کے حصول کی غرض سے اپنی قسم کا یہ پہلا انسٹیٹیوشن ہندوستان میں قایم کیا گیا تھا، لیکن وہ لکھتے ہیں کہ اصلاح کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ پہلے جمہور قوم کی جانب سے خواہ جلسوں کے ذریعہ سے یا فرداً فرداً ندوہ کے موجودہ ارا کین کے سامنے اصلاح کا پروگرام پیش کیا جائے اور خواہش کی جائے کہ وہ اپنے اس بڑے قومی انسٹیٹیوشن میں قوم کی آواز کا لحاظ کریں، پھر وہ لکھتے ہیں کہ پہلے یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے، جب اس طریقہ سے اصلاح ناممکن ہو تو تب دوسرا طریقہ (یعنی جوش کے ذریعہ سے کارکنان ندوہ کو مجبور کرنا) اختیار کیا جائے۔

ہم مختصراً عرض کرتے ہیں کہ آج بھی جلسہ دہلی میں وہی پہلا طریقہ موجود ہے، جس کی آپ نے ہدایت کی ہے، لیکن اڈیٹر صاحب اور عام پبلک کو یہ معلوم نہیں کہ یہ طریقہ پہلے اختیار کیا جا چکا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پہلے کبھی اس قسم کی خواہش نہیں کی گئی اور اس دفعہ دفعۃً جبر یہ طریقہ اختیار کرنا مقصود ہے لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ

ندوہ میں خرابیاں مدت سے ہیں اور میں نے بارہا فرداً فرداً اور اجتماعی طریقہ سے اس کی طرف توجہ دلائی۔ دوسال ہوئے کہ میں نے ایک مطبوعہ خط تمام ارکان کی خدمت میں بھیجا کہ موجودہ خرابیاں اس وجہ سے ہیں کہ ندوہ میں دونہایت مختلف الخیال اور مختلف المذاق قسم کے ممبر ہیں، اس لیے دونوں کی کشمکش کی وجہ سے کسی امر کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ اس بنا پر یہ مناسب ہوگا کہ یورپ کے قاعدہ کے موافق ایک مدت معین تک ایک مذاق کے تمام ممبر کام سے دست بردار ہوجائیں اور تنہا ایک فریق کو کام کرنے دیا جائے اور سب سے پہلے میں خود اور میرے ہم خیال اس کے موافق دست کش ہونے پر آمادہ ہیں لیکن یہ تجویز جلسۂ انتظامیہ میں نامنظور کی گئی۔

اس کے بعد مولانا عبدالباری صاحب نے جو اس وقت ندوہ کے ممبر تھے اصلاح کی کوشش کی اور اسی مضمون کے مطبوعہ خطوط جاری کیے اور ایک بڑا معرکۃ الآرا جلسہ ہوا، لیکن اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ ایک جلسہ مصالحت کا ہوا تھا، جس میں ارکان ندوہ کے علاوہ بعض اور معزز حضرات بھی شریک تھے۔ ۱۸، ۱۹، ۲۰ رجولائی ۱۹۱۳ء کو دفعۃً وہ انتظامات عمل میں آئے جس سے دور جدید کا آغاز ہوتا ہے۔

اس جلسہ میں بغیر اس کے کہ ایک منٹ قبل باہر کے ارکان کو خبر کی جائے تین سکریٹریاں جو پہلے مدت سے قایم تھیں اور ندوہ کے تمام کام انہی کے ذریعہ سے انجام پاتے تھے اور جن پر اعتماد کا ووٹ بار بار جلسۂ انتظامیہ میں بھی پاس ہو چکا تھا توڑ دی گئیں۔ یہ کارروائیاں چوں کہ ندوہ کے دستورالعمل کے رو سے بالکل بے قاعدہ تھی، اس لیے بارہا اس کی طرف ارکان مقامی کو توجہ دلائی گئی اور بعض اخبارات میں نہایت تفصیلی مضامین لکھے گئے لیکن کسی نے پرواتک نہ کی۔ بقول اڈیٹر صاحب کے جوش اور شوروغل اور ہنگامہ آرائی سب سے آخری علاج ہے، لیکن مجھ کو میرے دوست بتائیں کہ قومی احساس کا کیا حال ہے؟ کیا ہندوستان کے کسی معاملہ پر پبلک نے سرد اور معتدل آوازوں پر توجہ کی ہے؟ پولیٹکل

معاملات، یونیورسٹی ڈیپوٹیشن، علی گڑھ کالج میں سکریٹری اور اسٹاف کی قوت کا موازنہ، انجمن حمایت الاسلام کی اصلاح اور تقسیم عمل، اس میں کون سی چیز ایسی ہے جو بغیر ہنگامہ آرائی اور شوروغل کے انجام پائی۔

ان واقعات کے ساتھ فقط غریب ندوہ پر کیوں الزام ہے؟ کیا اسی کے لیے کہ وہ دولت مند اور امرا کا انسٹیٹیوشن نہیں ہے؟ لیکن بااین ہمہ اب بھی اس پہلے طریقے پر عمل کرنا مقصود ہے، جو بار بار استعمال کیا جا چکا ہے اور جس کی نسبت اڈیٹر صاحب ہمدرد ہم کو مشورہ دیتے ہیں کہ پہلے ہم کو اس سے کام لینا چاہیے۔ (گویا ہم نے اب تک اس سے کام نہیں لیا)۔

(ہمدرد، دہلی، یکم مئی ۱۹۱۴ء)

[۲۵]

جلسۂ دہلی کے متعلق
ایک عام غلط فہمی کی تردید

یہ خیال غلطی سے عام طور پر پھیل گیا ہے کہ دہلی میں ندوہ کی اصلاحی تجویز کے متعلق جو جلسہ ہونے والا ہے، وہ موجودہ کارکن اشخاص کی مخالفت اوران کے ساتھ معرکہ آرائی کا جلسہ ہے۔اس غلط خیال نے تمام پبلک میں ایک اشتعال آمیز (مخالف یا موافق) جوش پیدا کر دیا ہے۔قومیں جب ابتدائی ترقی کے دور میں ہوتی ہیں تو ان کا مذاق طبع ہر بات میں اشتعال انگیز پہلو کو ڈھونڈھتا ہے اور اس سے متاثر ہوکر اصل حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ندوہ کے چند امور مسلمۂ فریقین ہیں۔ یہ امر کہ ندوہ میں کچھ خرابیاں ہیں، دونوں کو تسلیم ہے۔ یہ امر ان خرابیوں یا اصل قانون ندوہ میں اصلاح کی حاجت ہے، دونوں فریق کو تسلیم ہے۔گفتگو صرف یہ ہے کہ یہ خرابیاں کس نے پیدا کیں؟ اوراب ان کی اصلاح کا کیا طریقہ ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ ہر فریق دوسرے فریق کو خرابیوں کا ذمہ دار بتاتا ہے اوراگر چہ اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی آزاد کمیشن بیٹھتا تو یہ مسئلہ صاف ہوجاتا،لیکن بہرحال ایسا کرنے میں مخالفت اور جوش کا زیادہ احتمال ہے،اس لیے سردست اسی نقطہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ خرابیاں کیا ہیں؟اوراصلاح کا کیا طریقہ ہوسکتا ہے؟

طریقۂ اصلاح کے متعلق ایک غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ خود ندوہ کے جلسہ انتظامیہ میں یہ خرابیاں پیش کی جاسکتی ہیں اور وہ خود ان کی اصلاح کرسکتا ہے لیکن واقعات یہ ہیں کہ جس زمانہ سے یہ خرابیاں اور بے ضابطگیاں ہیں، اس زمانہ سے یہ مسئلہ بارہا ندوہ کے ارکان کے سامنے آچکا ہے۔ سب سے پہلے ندوہ کے اصل قانون کا معاملہ ہے۔ دونوں فریق قانون کی بعض دفعات کی لغویت اور بداثری کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس بناپر متعدد جلسہ ہای انتظامیہ میں اس کی اصلاح کی خواہش کی گئی اور ہر صیغہ کے سکریٹری نے جن دفعات کو صاف کرنا یا ترمیم و تنسیخ کرنا ضروری سمجھا، اس کے متعلق اپنی تحریری رائیں لکھ کر بھیجیں۔ ایک جلسۂ انتظامیہ میں طے ہوا کہ مولوی ظہور احمد صاحب وکیل کے پاس یہ تمام رائیں بھیجی جائیں اور وہ سب کو غور سے پڑھ کے ایک مسودہ تیار کریں جو جلسۂ خاص میں پیش کیا جائے۔ دو برس گذر جانے پر بھی کچھ کام نہیں ہوا۔ بالآخر مولوی صاحب موصوف سے لے کر ایک اور ممبر صاحب کے حوالہ کیا گیا اور پھر بھی کچھ نہ ہوا، اسی بناپر یہ کہنا صحیح نہیں کہ خود ندوہ سے اصلاح کی خواہش نہیں کی گئی۔

دیگر معاملات کے متعلق تین دفعہ سرگرم کوششیں ہوئیں۔ ایک دفعہ مولوی عبدالباری صاحب نے جو اس وقت ندوہ کے ممبر تھے اس کی کوشش کی اور مطبوعہ خطوط جاری کیے۔ دوسری دفعہ مرزا ظفر اللہ خاں صاحب رکن ندوہ (۱) نے اصلاحی یادداشت چھاپ کر تمام ممبروں کے پاس بھیجی۔ میں نے بارہا اصلاحی معاملات پر توجہ دلائی یہاں تک کہ ایک دفعہ مطبوعہ خطوط کے ذریعہ سے یہ تحریک پیش کی کہ لبرل اور کنسرویٹو گروہوں کی طرح ایک خاص مذاق کے ممبر چند برس کے لیے ممبری کے کام سے دست کش ہو جائیں اور دوسرے فریق کے ممبر چند برس کے لیے ممبری کے کام سے دست کش ہوجائیں اور دوسرے فریق کو کام کرنے دیں اور اس کی ابتدا میں نے اپنی دست کشی سے کرنی چاہی، لیکن جلسۂ انتظامیہ میں یہ تجویز بھی نامنظور ہوئی۔

ان واقعات کے بعد قریباً ایک سال تک اخبار وکیل نے ندوہ کے نقائص پر لیڈر اور مضامین شایع کیے، لیکن پبلک کو مطلق احساس نہ ہوا۔

حالات مذکورہ کے بعد کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ اصلاح کی خواہش کی یہ پہلی صدا ہے اور اس سے کسی فریق کی توہین یا تذلیل مقصود ہے۔

دہلی کے جلسہ کا یہ پروگرام ہے کہ دونوں فریق الگ الگ اصلاحی پروگرام مرتب کر کے لائیں۔ ان میں جن اصلاحات پر دونوں فریق کا اتفاق ہو وہ اسی وقت جلسہ میں مشتہر کر دی جائیں، جن میں اختلاف ہو، ان کے تصفیہ کے لیے جلسہ کی طرف سے ایک سب کمیٹی مقرر کر دی جائے۔ اس میں ندوہ کے ارکان انتظامی بھی ممبر بنائے جائیں۔

اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے کہ ایسے مباحث نہ پیش ہوں جن سے ذاتیات معرض بحث میں آئیں، بلکہ ان امور کو لیا جائے جن کا تعلق ندوہ کے اصل قانون اور دستورالعمل سے ہے اور جن کے فیصلہ کے لیے جزئی واقعات کے تحقیق کرنے کی ضرورت نہ ہو، بلکہ خود قانون کا مطالعہ ان کا فیصلہ کر سکے مثلاً یہ بحث کہ موجودہ کارکن اور عہدہ دار واقعی عہدہ دار مجاز ہیں یا نہیں، واقعات کا چنداں محتاج نہیں، بلکہ اصل قانون پر نظر ڈالنا کافی ہو سکتا ہے اور جس قدر واقعات کی شہادت اس کے لیے درکار ہے وہ کھلے ہوئے اور نمایاں واقعات ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ بیداری کا سب سے نمایاں واقعہ عام قومی اجتماع ہے۔ لیکن اگر اس دور میں بھی کوئی قومی انسٹیٹیوشن صرف چند اشخاص کے ہاتھ کا بازیچہ بن کر رہ جائے تو قومی زندگی کی طرف سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیے۔

ارکان ندوہ کے علاوہ جو لوگ اس مسئلہ کو قوم میں لانے کے مخالف ہیں، صرف دو قسم کے لوگ ہیں، یا وہ ہیں جو آج ۲۲ ؍برس سے ندوہ کے مخالف اور اس کے وجود کے دشمن ہیں۔ ان کو اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ ندوہ کل کا تباہ ہوتا ہوا آج تباہ ہو جائے۔ یا وہ لوگ ہیں جو خود کسی انسٹیٹیوشن پر اسی طرح خودمختارانہ قابض ہیں اور ڈرتے ہیں کہ اس

آگ کے شعلے پھیلتے پھیلتے ان کے گھر تک نہ پہنچ جائیں۔فقط
شبلی نعمانی

(زمیندار روزانہ،۲۰ رمئی ۱۹۱۴ء)

تعلیقات و حواشی

ندوہ میں آپسی اختلافات جب حد سے تجاوز کر گئے اور طلبہ نے اسٹرائک کر دی اور ملک میں ہر طرف ندوہ کو لے کر تشویش کا اظہار ہونے لگا اس زمانہ میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو اصلاح ندوہ کا خواہاں تھا۔اس کے سرخیل علامہ شبلی علیہ الرحمہ تھے۔وہ چاہتے تھے کہ ندوہ کی خرابیاں دور کر کے اسے ایک بار پھر تازہ دم کر دیا جائے۔جبکہ دوسرا طبقہ صرف یہ چاہتا تھا کہ کسی شکل سے علامہ شبلی کو ندوہ سے باہر کر دیا جائے حالانکہ علامہ شبلی ندوہ کی معتمدی سے مستعفی ہو چکے تھے۔تاہم قدیم الخیال طبقہ ان کو کسی شکل میں برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔

اسی سلسلہ میں دہلی میں حکیم اجمل خاں وغیرہ کی کوششوں سے اصلاح ندوہ کا ایک جلسہ ہونا طے پایا۔اس کے بارے میں ملک میں جو عام فضا تیار ہوگئی تھی کہ اس میں حق و باطل کا فیصلہ ہوگا۔علامہ شبلی نے زیر نظر مراسلہ میں اس کی تردید کی ہے۔

(۱) مرزا ظفر اللہ خاں، رکن ندوہ: تفصیل دستیاب نہ ہوسکی۔

[۲۶]

ترکوں کی اعانت

جناب من!

بعض صاحبوں(۱) کا خیال ہے کہ ترکوں کی ہمدردی میں اگر قربانی کے بجائے قیمت دی گئی تو اس سے احتمال ہوگا کہ قربانی خود غیر ضروری ہے۔

لیکن یہ صحیح نہیں، شریعت میں فرائض کے درجات میں بھی ترتیب ہے اور وقتی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ غزوۂ خندق میں جہاد میں مصروف ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز عصر قضا ہوئی تو کیا یہ حجت ہوسکتی ہے کہ نماز کا قضا کرنا جائز ہے؟

ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے۔ اس لیے اس خاص موقع اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض مقدم رکھا گیا تو اس سے آیندہ کے لیے کیا حجت ہوسکتی ہے؟

قربانی شعارِ اسلام ہے، مسلمان اس کو نہیں چھوڑ سکتے، نہ کوئی قوم ان کو اس پر مجبور کرسکتی ہے، نہ وہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کی پروا کرسکتے ہیں۔

امید کہ میرا خط اور صاحبانِ اخبار بھی اپنے پرچوں میں نقل کردیں۔''

شبلی نعمانی

(بحوالہ حیات شبلی ص ۴۶۳)

تعلیقات وحواشی

جنگ کے زمانہ میں ترکی کے تعاون کے لئے علامہ شبلی نے یہ فتویٰ دے دیا تھا کہ قربانی نہ کر کے قربانی کی رقم ترکوں کو بھیج کر ان کی اعانت کی جائے۔ ان کے شاگرد مولانا ظفر علی خاں نے اس فتوے پر شبہ ظاہر کیا چنانچہ اس شبہے کے جواب میں علامہ شبلی نے یہ مراسلہ شائع کرایا۔

(۱) مولانا ظفر علی خاں[۱۸۷۰-۱۹۵۶ء] نامور ادیب، شاعر، مترجم، صحافی، سیاسی رہنما اور مشہور مجاہد آزادی تھے۔ روزنامہ زمیندار لاہور اور ہفت روزہ ستارہ صبح لاہور کے مدیر اعلیٰ رہے۔ زمیندار کی ادارت میں سر دھڑ کی بازی لگا دی، ضمانتیں ضبط ہوئیں، قرقیاں ہوئیں، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں مگر نشۂ آزادی ذرہ برابر کم نہیں ہوا۔ تحریک خلافت اور ملک کی آزادی میں ان کا بڑا نمایاں حصہ ہے۔

مولانا ظفر علی خاں جنوری ۱۸۷۳ء میں سیال کوٹ کے ایک گاؤں مہرتھ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک پٹیالہ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۹۲ء میں ایف اے پاس کر کے سری نگر محکمہ ڈاک میں ملازم ہوئے لیکن افسر سے نہیں بنی۔ چنانچہ ملازمت ترک کر کے بی اے کرنے علی گڑھ کالج آ گئے۔ اس زمانہ میں علامہ شبلی علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھے۔ یہاں خاص طور پر ان کا درس قرآن بہت مشہور تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے ان کے درس قرآن میں شرکت کی۔ علی گڑھ کالج میں وہ علامہ شبلی کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ (مکاتیب شبلی ج اص ۳۲۸) علی گڑھ میں طلبہ کی تنظیم لجنۃ الادب اور اخوان الصفا کے وہ سرگرم رکن رہے۔ تحصیل علم کے بعد وہ ریاست حیدرآباد کے دارالترجمہ میں ملازم ہوئے مگر ان کے باغیانہ خیالات کی وجہ سے انگریزوں نے نظام حیدرآباد سے کہہ کر وہاں سے نکلوا دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے والد کے اخبار زمیندار سے وابستہ ہوئے اور اسے آزادی و حریت کا نقیب بنا دیا۔ ۲۷ر نومبر ۱۹۵۶ء میں گجرانوالہ میں انتقال کیا۔

انہیں ابتدا ہی سے شعر گوئی سے بڑی دلچسپی تھی۔ علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانہ میں بھی وہ اردو فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اپنے استاذ علامہ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ملنے پر بڑا زبردست فارسی قصیدہ پیش کیا تھا جو حیات شبلی میں درج ہے۔ وہ آخر تک اپنے استاذ کا بڑے احترام سے ذکر کرتے رہے۔ (متاع رفتگاں، ص ۷۷-۷۸)

اشخاص

(الف)

(ہ)

(ی)

☆☆☆

کتب

(الف)

(ن)

(و)

(ہ)

(ی)

مقامات

(الف)

(ب)

(ی)

☆☆☆

تعلیمی و علمی ادارے

(الف)

(ن)

☆☆☆

کتابیات

کتب

۱۔ آثار شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء

۲۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور، جلد اول، مطبوعہ ۱۹۶۴ء

۳۔ اقبال کامل، مولانا عبدالسلام ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۹ء

۴۔ الاعلام، خیرالدین الزرکلی، بیروت، ۱۹۸۷ء

۵۔ الانتقاد، علامہ شبلی نعمانی، مرتبہ ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۲۰۱۴ء

۶۔ امام رازی، مولانا عبدالسلام ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۵۰ء

۷۔ تاریخ ندوۃ العلما (اول و دوم) مولانا اسحاق جلیس ندوی، ڈاکٹر شمس تبریز خاں، مجلس صحافت و نشریات، لکھنؤ، ۲۰۱۱ء

۸۔ تذکرہ خاندان عزیزی، حکیم سید ظلم الرحمٰن، علی گڑھ، ۱۹۷۸ء

۹۔ تذکرہ رحمانیہ، محمد عبدالحلیم انصاری، مکتبہ نفیس لاہور، ۱۹۸۰ء

۱۰۔ تذکرہ علامہ جلال الدین سیوطی، ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی، الرحیم اکیڈمی، کراچی۔

۱۱۔ تذکرہ محسن، مولوی امین زبیری، جامع برقی پریس، دہلی، ۱۹۳۵ء

۱۲۔ حواشی کلیات مکاتیب اقبال (اول و دوم) سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۰ء

۱۳۔ حیات امام مالک، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

۱۵۔ حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ 2015ء

۱۶۔ ذکر فراہی، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، ۲۰۰۱ء

۱۷۔ صدر یار جنگ، ڈاکٹر شمس تبریز خاں، ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۱۹۷۲ء

۱۸۔ سیر اعلام النبلاء جلد پنجم، علامہ ذہبی، بیروت، ۱۹۹۰ء

۱۹۔ سیرۃ البخاری، مولانا عبدالسلام مبارکپوری، الٰہ آباد، ۱۳۶۷ھ

۲۰۔ شبلی اور جہان شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ ۲۰۱۵ء

۲۱۔ گلستان حدیث، مولانا محمد اسحاق بھٹی، الکتاب انٹرنیشنل دہلی، ۲۰۱۲ء

۲۲۔ متاع رفتگاں، شاہ معین الدین احمد ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ، ۲۰۱۵ء

۲۳۔ مقالات شبلی جلد ہشتم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء

۲۴۔ مکاتیب شبلی اول، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء

۲۵۔ مکاتیب شبلی دوم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۲۶۔ مکتوبات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۲۷۔ وقار حیات، اکرام اللہ خاں ندوی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ، ۱۹۲۵ء

۲۸۔ وفیات معارف، محمد سہیل شفیق، قرطاس کراچی، ۲۰۱۳ء

۲۹۔ یاد رفتگاں، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۴ء

۳۰۔ یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء

رسائل

۳۱۔ ماہنامہ الندوہ، لکھنؤ: جنوری ۱۹۰۹ء، جنوری ۱۹۱۲ء

۳۲۔ الہلال کلکتہ، ۱۱رفروری ۱۹۱۴ء

۳۳۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ: ۱۶رجنوری ۱۸۹۴ء،

۳۴۔ زمیندار لاہور: ۱۰راپریل ۱۹۱۳ء، ۱۵راپریل ۱۹۱۳ء

۳۵۔ سرمور گزٹ ناہن: ۳رفروری ۱۸۹۳ء

۳۶۔ معارف اعظم گڑھ : ستمبر ۱۹۲۷ء، نومبر ۲۰۱۳ء، دسمبر ۲۰۱۳ء مارچ ۲۰۱۴ء

ISBN 938220104-1
9 789382 201045

₹ 150.00